علامہ اقبال بھوپال میں

سیفیہ کالج بھوپال

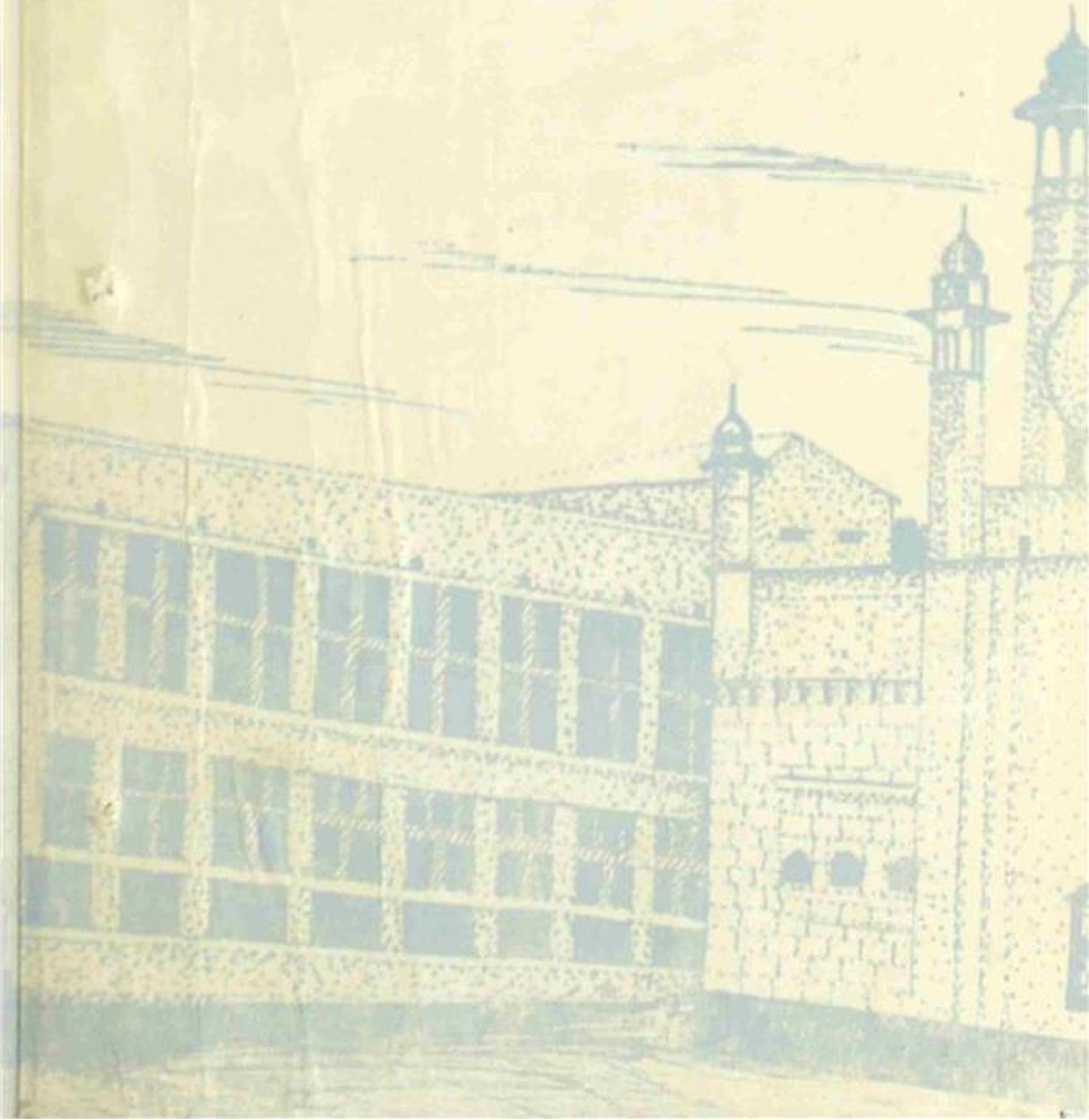

علامہ اقبال

بھوپال میں

KUTUB KHANA ANJUMAN TARAQQI-E-URDU (HIND) * ALIGARH *
کتب خانہ
انجمن ترقی اردو
(ہند)
علیگڑھ

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

عبدالقوی دسنوی

شعبۂ اُردو

سیفیہ کالج بھوپال

۱۹۶۷ء

علوی پریس بھوپال

سرورق بینا پریس بھوپال

ایک روپیہ پچیس پیسے

۱۹۵۸
۱۵۸ — ۵:۱

فخرو بھائی

کے

نام

جن کے بارے میں کہا جاتا ہے

"زرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو"

عبدالقوی دسنوی

نگاہ

(علامہ اقبال نے یہ نظم "ریاض منزل" بھوپال میں تحریر کی ہے)

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی!
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر! یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی!
سفر عروسِ قمر کا عماری شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی!
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی!

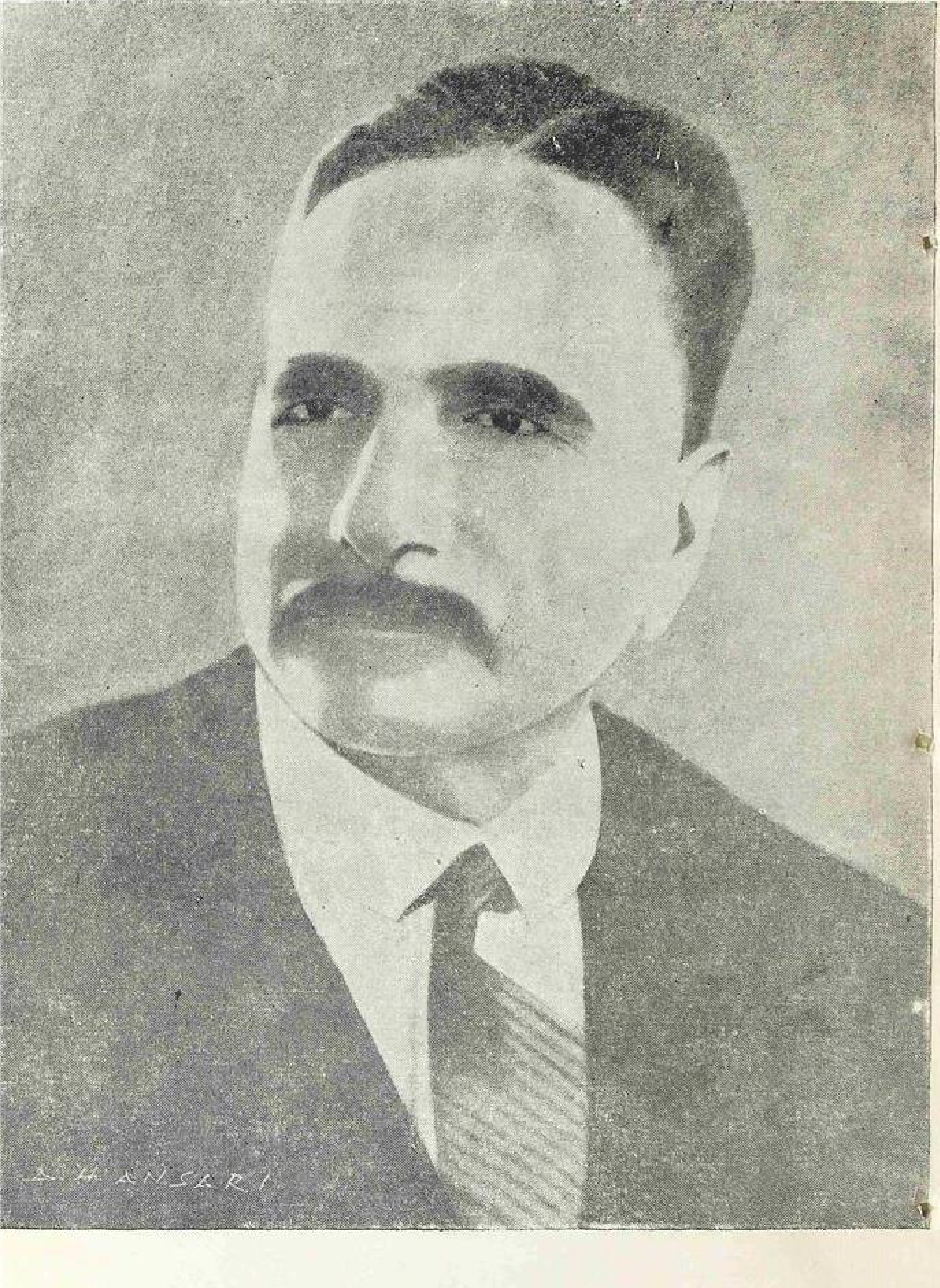

علامہ اقبال
(بشکریہ جناب عبدالحلیم انصاری آرٹسٹ - بھوپال)

زندگی کے آخری عہد میں مرحوم (علامہ اقبال) کا توسّل دربارِ بھوپال سے ہوگیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہوگئی تھی۔ دورِ آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلے میں بھوپال کی نجاتِ آخروی یقینی ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدتمند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو اُن عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

(رشید احمد صدیقی۔ گنجہائے گرانمایہ)

یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے جب میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں طفلی کی معصومیت کبھی تحیر کبھی تفکر اور کبھی تجسس سے ہمکنار رہتی ہے۔ دنیا اس قدر محدود نظر آتی ہے جتنا گاؤں یا محلہ اور اس کی آبادی اتنی مختصر جتنی گاؤں والوں کی۔ محبت، پیار اور حاجت روائی کرنے والی شخصیت ماں کی، سب سے بارعب اور پُر وقار شخصیت باپ کی اور سب سے زیادہ پرہیبت شخصیت استاد کی ہوتی ہے۔ گاؤں کے مدرسہ "انجمن اصلاح و سنہ" میں میرا داخلہ کرا دیا گیا تھا۔ روز کا دستور تھا صبح سویرے اُٹھنا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر مدرسہ کی راہ لینا۔ پڑھائی ہو یا نہ ہو، طبیعت مدرسہ جانے کے لئے کبھی مائل نظر آتی اور کبھی بیزار۔

مدرسہ جب کھلتا تو سب سے پہلے مولوی علی حسن صاحب کی گرج دار آواز کانوں میں گونجتی۔ ہم لوگ خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور پھر چند طلبہ علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بڑے جوش و خروش کے ساتھ گاتے اور تمام مدرسہ کے طلبہ ان کی آواز سے آواز ملاتے۔ میری زندگی میں یہ پہلی نظم تھی جسے ہر روز لہک لہک کر گانے کا موقع ملتا تھا اور یہی وہ نظم تھی جس نے رفتہ رفتہ وطن کی عظمت کا احساس پیدا کیا اور دنیا والوں کے سامنے سربلندی کا جذبہ بیدار کیا۔

پھر ایک صبح ایسی آئی جسے میں اب تک بھلا نہ سکا۔ ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ پہنچے تو ہمارے اساتذہ مغموم صورت بنائے کھڑے تھے۔ اس دن گھنٹہ بجنے کے بعد ترانہ نہیں گایا گیا بلکہ ہمیں یہ خبر سنائی گئی کہ علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ وہی اقبال جس کا ترانہ ہر روز صبح

کے وقت ہم بڑے جوش وخروش سے گاتے تھے۔ پھر چھٹی کا اعلان ہوا اور ہم لوگ خوش خوش گھر چل دیئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس وقت ہم لوگوں کو اقبال کی موت پر کچھ رنج بھی ہوا یا نہیں لیکن خیال ضرور آتا ہے کہ پہلی بار احساس غم ضرور پیدا ہوا تھا۔ شاید اساتذہ کو ملول اور رنجیدہ خاطر دیکھ کر ایسا ہوا ہو لیکن جب گھر پہنچا تو بزرگوں میں بھی علّامہ اقبال کی رحلت کا ذکر ہو رہا تھا جس کی وجہ سے یہ احساس ضرور دل میں پیدا ہوا کہ ہمارا کوئی عزیز ہم سے بچھڑ گیا ہے یا کوئی انمول یا پیاری چیز ہم سے چھین لی گئی ہے۔

بات آئی اور گئی پھر ہم لوگ روزانہ مدرسہ جاتے اور آتے رہے لیکن مجھے خیال نہیں ہے کہ کبھی بھولے سے ہم لوگوں نے اقبال کو یاد کیا ہو اور کرتا بھی کیسے۔ ہمارا ذہن و دماغ ایسے بلند انسان کو سمجھنے کے لائق کب تھا۔ اس لئے ہم ایسے عظیم سانحہ اور گرانمایہ شخصیت کے کھو جانے سے متاثر نہیں ہوئے۔

۱۹۴۰ء میں تعلیم حاصل کرنے کھڑگپور (بنگال) چلا گیا۔ جب ۱۹۴۱ء کے دسمبر کی تعطیل گزارنے وطن پہنچا اور چھٹی ختم ہونے کو آئی تو معلوم ہوا کہ کھڑگپور میں جاپانیوں کی بمباری کا خطرہ ہے چنانچہ وہاں جانے کے بجائے رانچی بھیجدیا گیا۔ یہیں اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ویسے یہ بات بالکل درست ہے کہ میری عمر کے اعتبار سے یہ کتاب یقیناً ایسی نہ تھی جسے ہم پڑھتے یا پڑھنے کا شوق رکھتے لیکن میرے دوست رکن الدین کو اس کتاب کی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" بہت پسند تھیں۔ انھیں ان نظموں کا پس منظر بھی بہت کچھ معلوم تھا۔ انھیں کی وجہ سے اقبال کی ان دونوں نظموں سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور ان نظموں کے مختلف بند بغیر سمجھے ہوئے زبانی یاد کر لئے ــ یہیں اقبال کی شاعری سے میری دوسری بار شناسائی ہوئی۔

جب میں تعلیم سے فراغت پاکر فروری ۱۹۶۱ء میں بھوپال آیا تو اس وقت تک اقبال کو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کر چکا تھا اور ان کی عظمت کا معترف اور شاعری کا دلدادہ ہو چکا تھا۔

ان کے افکار، خیالات اور تصورات دل کے مختلف گوشوں پر اپنا سکہ جما چکے تھے۔ یہاں اقبال کے عاشق اور ان کے دیوانے ان کی آمد کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے نظر آئے۔ میں نے ایسے لوگوں کی آنکھوں میں اس تذکرے کے ساتھ خوشی کی چمک، چہروں پر مسرّت کی دمک اور دلوں میں فخر کے جذبات محسوس کئے لیکن مجھے یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ یہاں کب آئے؟ کیوں آئے؟ اور نواب صاحب بھوپال سے ان کے کس قسم کے تعلّقات تھے؟ اور سر راس مسعود نے دوستی کا حق کس طرح ادا کیا؟ اس قسم کے خیالات ہمیشہ دل میں چٹکیاں لیتے رہے۔ یہاں کے لوگوں سے دوبارہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی مایوس ہونا پڑا۔ اس لئے کہ اس دور کے اُن لوگوں میں سے جو علاّمہ سے قریب رہے تھے بہت کم موجود ہیں باقی یا تو بھوپال چھوڑ چکے ہیں یا ملک عدم کی راہ لے چکے ہیں، لیکن میں نے ہمّت نہیں ہاری اور باوجود نامساعد حالات کے کوشش جاری رکھی۔

علامہ اقبال سے ملنے والوں میں خاص طور سے ممنون حسن خاں صاحب کا نام لیا گیا۔ موصوف اس زمانہ میں سر راس مسعود کے سکریٹری تھے اور علامہ اقبال کی دیکھ ریکھ کا کام انجام دے رہے تھے۔ خان صاحب علاّمہ اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس دور کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں۔ ان سے علامہ اقبال اور بھوپال کے تعلّق سے متعلّق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے بہت حد تک میری رہنمائی، ہمّت افزائی اور بڑی مدد کی۔ ان کے علاوہ عبدالحلیم انصاری صاحب، اقبال حسین خاں صاحب، حکیم قمرالحسن صاحب، زبیر احمد صدیقی صاحب یوسف قیصر صاحب اور اختر سعید خاں صاحب سے اس سلسلے میں کافی تعاون ملا۔ دراصل ان صاحبان کی دلچسپیوں نے ہی اس کام کو اس منزل تک پہنچانے میں میری ہمّت افزائی کی۔

سرزمین بھوپال کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں ہر زمانے اور ہر دور میں ملک کے باکمالوں کی قدر ہوتی رہی ہے۔ شاید اس سرزمین کی مردم شناسی اور قدر افزائی ہی کی وجہ سے اہل علم حضرات کی آمد کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔ چنانچہ سید ظہیر الدین دہلوی، مرزا شاغل دہلوی، اسلم جیراجپوری، ذاکر حسین ثاقب لکھنوی، احسن اللہ خاں ثاقب بدایونی، احمد علی شوق قدوائی، کلب احمد مانی جائسی، مضطر خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، افتخار عالم مارہروی، عبدالرزاق البرامکہ، سر راس مسعود امین زبیری، نیاز فتحپوری، جگر مرادآبادی، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ محوی صدیقی لکھنوی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں جن کا قیام مختلف وقتوں میں یہاں رہا۔ ان میں زیادہ تر لوگ بغرض ملازمت یہاں آئے تھے۔ البتہ جگر مرادآبادی اور ثاقب وغیرہ کا تعلق ملازمت کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ نواب صاحب یا یہاں کے لوگوں کی کشش تھی جو بار بار انھیں یہاں کھینچ لاتی تھی۔ ان میں سے چند نے تو بھوپال کو اپنا وطن ثانی بھی بنا لیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کا تعلق بھوپال سے کچھ اور تھا۔ وہ نواب صاحب کے قدرداں اور ان کے سیاسی شعور کے مداح تھے۔ دراصل نواب صاحب ہندوستانی سیاست سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اس کی پیچیدگیوں سے باخبر رہتے تھے۔ ویسے بیرون بھوپال سیاست سے ہٹ کر سماجی اور تعلیمی کارناموں سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے۔ انھیں سیاسی، سماجی اور تعلیمی کاموں کے لگاؤ کی وجہ سے دیدہ ور لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طرح ہندوستان میں ان کے مداحوں کا حلقہ وسیع تھا۔ علامہ اقبال بھی نواب صاحب کے مداحوں میں سے تھے لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ نواب صاحب سے ان کا تعلق کب پیدا ہوا اور کونسی چیز اس تعلق کا باعث بنی۔ البتہ علامہ اقبال کے ایک خط بنام غلام نیرنگ بھیک مرحوم سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۷ء سے قبل ہی وہ نواب صاحب سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک چندے کے سلسلے میں نواب صاحب سے مدد کا یقین رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لاہور ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء[1]

"........ اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی تو والئ بھوپال سے

مدد کی التجا بہتر ہو گا" ...."

اسی تعلق کی بنا پر وہ اکثر بھوپال بھی تشریف لاتے تھے اور نواب صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ان سے مشورے بھی لیا کرتے تھے ۔

دراصل ہندوستانی سیاست کا رنگ دیکھ کر علامہ اقبال آہستہ آہستہ سیاست میں دخیل ہو گئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی اختیار کر لی تھی چنانچہ سیاست سے ان کا اس قدر گہرا لگاؤ ہو گیا تھا کہ جب دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی تو اس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے ۔ اس کانفرنس میں ان کے ساتھ غلام رسول مہر بھی تھے ۔ غلام رسول مہر سیاسی شعور رکھنے کے علاوہ اس کانفرنس میں علامہ کے ساتھ اس لئے بھی ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے انھیں مدد ملے گی ۔

نواب حمید اللہ خاں اپنے سیاسی افکار کی وجہ سے اس زمانے میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے ۔ اس لئے علامہ اقبال نے کانفرنس میں شریک ہونے سے پہلے نواب صاحب سے ملنا مناسب سمجھا ۔ چنانچہ ۷ مئی ۱۹۳۱ء کو نذیر نیازی صاحب کو اسی سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :

"میں[2] پرسوں بھوپال جا رہا ہوں ۔ دو چار روز وہاں قیام رہے گا ۔ اگر قومی سرمایہ مسلمان جمع کر سکیں تو میرا اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادۂ قربانی اور اپنے حقوق کے لئے ایجی ٹیشن کرنے کی جرأت و ہمت موجود ہے "

علامہ اقبال سیاسی گفتگو کے سلسلے میں تشریف لا رہے تھے تا کہ نواب صاحب سے کانفرنس کے سلسلے میں تبادلہ خیال ہو جائے ۔ چنانچہ نذیر نیازی[3] لکھتے ہیں کہ " حضرت علامہ (اقبال) بھوپال

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۲۰۹ [2،3] مکتوبات اقبال صفحہ ۶۸ ۔

جا رہے تھے اور تقریب دہی سیاسی گفت وشنید"

علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں زیادہ نہیں رہا وہ ۹ مئی کو بھوپال کے لئے روانہ ہوئے تھے اور ۱۴ مئی کی صبح کو لاہور واپس پہنچ گئے تھے۔ ان کے ۱۴ مئی ۱۹۳۶ء کے مکتوب بنام مولوی محمد صالح صاحب اس سفر کا مختصراً حال معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں[1] ابھی صبح بھوپال سے واپس آیا ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب بھوپال کی دعوت پر اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کرکے ان کو ایک مرکز پر متحد کیا جائے۔ معاملہ امید افزا ہے مگر افسوس ہے کہ چونکہ ہر روز قریب دو بجے رات تک کام کرنا اور جاگنا پڑا میں وہیں بیمار ہوگیا۔ آج صبح واپس آیا ہوں۔"

جناب اقبال حسین خاں صاحب جو اس زمانہ میں بی۔ اے کرنے کے بعد نواب صاحب کے ساتھ رہتے تھے بیان کرتے ہیں علامہ اقبال نواب صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد جب کمرے سے باہر آئے تو تھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے کے نقوش سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی اہم مسئلہ پر گفتگو ہوئی ہے۔

اس سفر میں علامہ کا قیام "راحت منزل" میں تھا، جہاں کھانے کے کمرے میں علامہ اقبال سے ان کی تھوڑی بات چیت ہوئی۔ علامہ اقبال نے دریافت کیا کہ کیا آپ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اقبال حسین خاں صاحب نے جواب دیا کہ شعر و شاعری سے زیادہ تعلق تو نہیں ہے البتہ گاہے گاہے شعر کہہ لیتا ہوں۔ چنانچہ علامہ نے سنانے کی فرمائش کی۔ جب خان صاحب نے اپنی غزل سنائی تو علامہ نے پسند فرمایا۔ البتہ مطلع میں اصلاح کر دی۔ اصلاح شدہ شعر خان صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اپنا مطلع نکال دیا اور اب تو انھیں اپنا شعر یاد بھی نہیں۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۳۸۸

پوری غزل حسب ذیل ہے :

نگاہ بے پردہ سوز میری نقاب کیسا حجاب کیسا
تمہاری ان پردہ بندیوں کا ملا ہے تم کو جواب کیسا
نکل گئیں کیوں یہ بہکی باتیں قدم مرے کیسے لڑکھڑائے
نسیم کوچہ سے کس کے آئی مہک رہا ہے گلاب کیسا
کسی کی مست انکھڑیوں میں زاہد جھلک تلطّف کی میں نے پائی
تجھے مبارک تری نصیحت میری خطا کا حساب کیسا
تلاش میں اُن کی کھو گیا میں تو دل میں میرے سما گئے وہ
پھر اب کہو تو بلاؤں کس کو پکاروں کس کو خطاب کیسا
ہر ایک ذرّہ دمک رہا ہے ہر اک فضا میں ہے دلربائی
یہ سارے کون و مکاں پہ چھایا ہے تیرا رنگیں شباب کیسا
کبھی ازل میں کسی نے چھیڑا تھا میرے تارِ نفس کو ہمدم
مگر ابھی تک فضا میں ہر سو یہ بج رہا ہے رباب کیسا
وہ تم کو اقبالؔ خواب میں جب گلے سے اپنے لگا گئے ہیں
وہ خواب ہے زندگی کا حاصل بھلا بتاؤ وہ خواب کیسا

علامہ اقبال کئی سال سے درد گردہ کے مرض میں مبتلا تھے ۔ یہ تکلیف ۱۹۲۸ء میں شروع ہوئی تھی ۔ سید نذیر نیازی کی مدد اور مشورے سے حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری دہلوی کا علاج شروع ہوا ۔ اور کافی فائدہ ہوا ۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب علامہ اقبال یکایک علیل ہوئے اور شروع میں انگریزی دوائیں استعمال کی گئیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوا ، جس کے سبب علامہ افسردہ خاطر اور پریشان نظر آنے لگے ۔

بیماری کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ علامہ عید کی نماز پڑھنے (۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء) چودھری محمد حسین، جاوید اقبال اور اپنے ملازم علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے۔ موسم سرما کا تھا۔ اس دن خاص طور سے ٹھنڈک میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ علامہ صرف شلوار اور کوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ مسجد میں کافی دور تک ننگے پاؤں بھی چلنا پڑا تھا۔ مسجد سے واپسی پر دہی اور سوئیاں کھائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عید کے دوسرے ہی دن سخت نزلے کی شکایت ہوگئی۔ نزلے کا علاج ہوا لیکن فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ کچھ دنوں بعد کھانسی کی تکلیف ختم ہوگئی لیکن گلا بیٹھ گیا۔ آواز اس قدر بیٹھ گئی تھی کہ وہ بات چیت کرتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی سرگوشیاں کرتا ہو۔ (نذیر نیازی۔ علامہ اقبال کی آخری علالت)۔ آخر حکیم نابینا کا علاج شروع ہوا اور کافی فائدہ ہوا۔ اگرچہ آواز کی خرابی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ نذیر نیازی صاحب تحریر کرتے ہیں:

"اس طرح[1] ۱۹۳۴ء بخیر خوبی گزر گیا۔ ۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڈھ جاتے ہوئے دہلی سے گزرے اور میں اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انکی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ واپسی پر انھوں نے حکیم صاحب سے ملاقات فرمائی۔ انھوں نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی"

سر سید احمد کے پوتے سر راس مسعود اسی زمانے میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے۔ علامہ اقبال سے وہ بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال اور سر راس کے اس تعلق کی وجہ مصنف "روزگار فقیر" یہ بتاتے ہیں کہ

"چونکہ[2] سر راس مسعود ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے ڈاکٹر محمد اقبال کے وہ غائبانہ مداحوں میں تھے اور ان کی ذات سے بڑی دلچسپی

---

۱ اقبال۔ انجمن ترقی اردو ص ۳۰۴ ۲ روزگار فقیر ص ۱۵۱

"رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب سے ان کی دوستی کا آغاز غالباً حیدر آباد دکن سے ہوا۔ (۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء) ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ تشریف لے گئے تو سر راس مسعود سے تفصیلی ملاقات ہوئی"۔[1]

چنانچہ علامہ اقبال کی علالت کی خبر سن کر وہ بیحد متفکر ہوئے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کا علاج بھوپال ہی میں ہو۔ یہ سر راس مسعود سے علامہ کا تعلق ہی تھا کہ وہ بھوپال میں علاج کے لئے تیار ہو گئے اور ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لائے ۳۰ جنوری کو ان کا قیام دہلی میں رہا۔ دہلی میں قیام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں دنوں خالدہ ادیب خانم دہلی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ ان کے خطبات کا سلسلہ جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام ہو رہا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر انصاری نے کوشش کی تھی کہ ان کے کسی ایک خطبہ کی صدارت علامہ اقبال قبول فرمائیں لیکن اُس وقت انھوں نے خرابی صحت کا عذر پیش کیا تھا مگر جب خطبہ کا سلسلہ شروع ہوا اور خالدہ ادیب خانم نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق عجیب عجیب باتیں کیں تو علامہ بیحد متفکر، متعجب اور مضطرب ہوئے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو وہ نذیر نیازی صاحب کو تحریر کرتے ہیں :

"مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انھوں نے (خالدہ ادیب خانم) ظاہر کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے...... کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے کلچرل تصادم میں نبی امی صلعم کی شخصیت اور قرآن پاک نے کیا حصہ لیا، مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کیوں کہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل اثرات کو دبائے رکھا۔ نیز خود مسلمان بھی دو ڈھائی سو سال تک یونانی فلسفہ کا شکار رہو گئے"۔

---

[1] "اقبال" انجمن ترقی اردو ص ۳۰۵

اسی لئے علامہ کے دل میں خالدہ ادیب خانم سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تاکہ اُن سے مل کر ان کے اس قسم کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر سکیں چنانچہ دہلی آنے کی اطلاع نذیر نیازی صاحب کو دی:

"میں ۲۹ر جنوری شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ر کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹیر میل سے سفر کروں گا۔ جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ کونسل خانے میں قیام کرونگا ...... باقی خیریت ہے۔ دوا ابھی میرے پاس ہے۔ مزید دوا کے لئے اسٹیشن پر گفتگو ہوگی۔ پھر آپ اسے بھوپال (معرفت سر راس مسعود ریاض منزل) ارسال کر دیں۔"[1]

پروگرام کے مطابق بھوپال تشریف لاتے ہوئے ۳۰ر جنوری کی صبح کو وہ دہلی اُترے اور خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبے کی صدارت کی اور اثنائے گفتگو میں اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن جیساکہ خیال ہے علامہ اقبال کی باتوں سے وہ متفق نہیں ہوئیں۔ اس کے بعد وہ بھوپال کے لئے روانہ ہوئے اور ۳۱ر جنوری ۳۵ء کو وہ بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں آمد کے سلسلہ میں جناب ممنون حسن خاں بیان کرتے ہیں کہ "ڈاکٹر اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی، جب وہ سر راس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ گلے کی تکلیف کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ سر راس مسعود نے انھیں بلانے کے لئے تار وغیرہ میرے ذریعہ ہی بھجوائے تھے۔ جس گاڑی سے علامہ اقبال بھوپال آرہے تھے وہ رات کے وقت یہاں پہنچتی تھی۔ انھیں لینے کے لئے میں اور سر راس اسٹیشن گئے تھے۔ نواب صاحب نے ملٹری سکریٹری کرنل سر اقبال محمد خاں (C.I.E) کو بطور اپنے نمائندے کے بھیجا تھا حالانکہ وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے تشریف نہیں لارہے تھے۔ اسٹیشن پر ہم لوگ پنجاب میل کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سر راس مسعود بڑی بےچینی سے علامہ کا انتظار

---

[1] مکتوبات اقبال ص ۲۵۲

کر رہے تھے، جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو۔ جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اُترے۔ سر راس کی جب نظر ان پر پڑی تو اس طرف بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے مُنھ کے اس قدر بوسے لئے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے ہی کھڑا عجیب نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جلد ہی سر راس مسعود میری طرف متوجہ ہوئے اور علامہ اقبال سے کہا، اس لڑکے سے ملو۔ یہ میرا سکریٹری ہے اور تمھارے کلام کا عاشق۔ اسے تم سے زیادہ تمھارا کلام یاد ہے۔ میں فرطِ مسرت سے آگے بڑھا۔ جھک کر سلام کیا اور اُنھوں نے مجھے گلے سے لگایا۔

اس کے بعد کرنل اقبال محمد خاں آگے بڑھے اور کہا کہ نواب صاحب نے سلام کے بعد یہ کہلوایا ہے کہ اگر آپ اور سر راس مسعود صاحب اجازت دیں تو شاہی مہمان خانے میں قیام کا انتظام کیا جائے آپ کے وہاں قیام سے نواب صاحب کو بے حد خوشی ہوگی۔ علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کا شکریہ ادا فرمایا کہ میں تو اس وقت اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ نواب صاحب سے ضرور ملوں گا۔ ان کو میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیجیے گا۔

علامہ اقبال کے پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس کی گاڑی کے پیچھے ہی آگیا۔ سامان اُٹھانے والی گاڑی اگرچہ آئی تھی۔ لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی اور وہ خالی واپس گئی۔

علامہ اقبال کا قیام " ریاض منزل " میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال کے مشہور تالاب "بڑے تال" کے کنارے ہے۔ بھوپال کا یہ مقام بڑا حسین اور دلفریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سرزمین کے لئے قدرت کا یہ ایک حسین عطیہ ہے۔ اس مکان کے بالائی حصے میں سر راس نے ایک کمرہ بنوایا تھا۔ اسی میں اُنھیں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر اقبال نے اپنی نظم " نگاہ " تخلیق کی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی ریاض منزل پہنچے بیگم مسعود نے علامہ کا خیر مقدم کیا۔ علامہ اقبال اُن سے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ملے۔

چونکہ سر راس مسعود کے کہنے پر نواب صاحب نے مجھے خاص طور سے ڈاکٹر صاحب کی

پیشی میں مقرر کر دیا تھا۔ اور میری دفتر کی حاضری معاف فرما دی گئی تھی۔ اس لئے صبح سے میں بجائے سر راس مسعود کے سکریٹری ہونے کے اقبال کا خادم ہو کر کام کرنے لگا تھا۔ سر راس نے علامہ کو بتا دیا تھا کہ انھیں جس بات کی ضرورت ہو اس کی اطلاع ممنون حسن خاں کو دیں یہ اسکی تعمیل کرینگے۔

رات کے کھانے کا انتظام سر راس مسعود نے خاص طور سے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے سر راس مسعود کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں کھانا کھایا۔ کھانے کے درمیان ہی علامہ اقبال نے کہا کہ میرا کھانا سادہ ہونا چاہئے اور ڈائننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے اگر میں ڈائننگ روم میں نہ آسکوں تو برا نہ مانئے گا۔ مجھے جس وقت بھوک لگے گی کھا لوں گا۔ کھانے کے بعد میں علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمانِ عزیز کے لئے بچھوایا تھا اُسے ان کے ملازم نے اُٹھا دیا تھا اور اُس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر ہی پر سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے قریب ہی ایک پنجابی حقہ رکھا ہوا تھا۔

دوسرے دن علامہ اقبال نے فرمایا کہ نواب صاحب سے ملنے کا وقت لے لیا جائے۔ چنانچہ ملنے کا وقت مقرر کر لیا گیا۔ ٹھیک وقت پر سر راس علامہ اقبال کے ساتھ نواب صاحب سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ میں بھی بحیثیت خادم ان کے ساتھ تھا۔ یہاں سے پہلے ہی ٹیلیفون کر دیا گیا تھا کہ قصر سلطانی کے لئے ہم لوگ فلاں راستے سے آ رہے ہیں۔ جیسے ہی گاڑی محل میں آکر رکی ہم لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب نیچے کی سیڑھی پر علامہ اقبال سے ملنے کے لئے کھڑے ہیں۔ نواب صاحب بڑے احترام اور محبت کے ساتھ علامہ سے ملے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں سے مل رہے ہیں۔ پھر نواب صاحب علامہ کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ جہاں صرف ہم چار آدمی تھے بس سب سے پیچھے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلد ہی کانی کا دور چلا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ

اقبال صاحب آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے جس پر علامہ نے کہا کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں ہے۔ نواب صاحب نے صحت کے بارے میں پوچھا تو علامہ نے بیماری اور تمام علاج کی تفصیل بتائی اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نوا صاحب نے An Intepretation of Holy Quran in the light of modern philosophy کے بارے میں دریافت کیا۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے کچھ تیار بھی کیا ہے، لیکن کچھ کتابیں بیرون ملک میں ہیں اُنھیں دیکھ لینا چاہتا ہوں مجھے آکسفورڈ اور کیمرج میں Extension lecture کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو اُن کتابوں کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو ساری ملت اسلامیہ بلکہ ساری دنیا کے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور آپ نے مجھے جو تحفے دیئے ہیں ان میں سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔ اگر اس میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو جیسا کہ میں نے مسعود سے کہا ہے ہر طرح کی امداد کے لئے تیار ہوں۔ پھر دوسری باتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد نواب صاحب سے علامہ اقبال نے جانے کی اجازت چاہی۔ اُنھوں نے کہا کہ چونکہ آپ مصروف ہیں اس لئے جانے کی اجازت دیجئے۔ نواب صاحب گاڑی تک پہنچانے آئے۔ سر راس مسعود اور علامہ اقبال پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی "ریاض منزل" کے لئے روانہ ہوئی۔

ممنون حسن خاں صاحب بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال چونکہ بیمار تھے اس لئے روزانہ کافی خطوط ایسے آتے تھے جن میں صحت کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا۔ اس لئے علامہ کے خطوط کے لئے سر راس مسعود کی طرح الگ Mail Bag جاتا تھا۔ تمام خطوط ممنون حسن خاں اپنے پاس رکھتے تھے۔ صبح کے وقت تمام خطوط علامہ کو سنا دیئے جاتے تھے اور پھر خطوط کے جو کچھ وہ جواب لکھاتے تھے پہلے پنسل سے لکھ لئے جاتے تھے۔ پھر صاف کرکے یا ٹائپ کرکے ان کے پاس دستخط کے لئے بھیج دیئے جاتے تھے۔ یہ خطوط نوجوانوں سے لے کر والیان ریاست تک کے ہوتے تھے۔

خصوصاً علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کے خطوط زیادہ آتے تھے جو دریافت صحت کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ بیرونِ ملک سے بھی اسی سلسلہ میں زیادہ تر خطوط آتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے علامہ کی صحت کے بارے میں خبریں نشر ہوتی تھیں۔

یہاں طبی معائنہ کے بعد علاج شروع ہوا علاج Ultra voilet Rays کے ذریعہ ہونا قرار پایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن جو اس زمانے میں بھوپال کے سب سے اونچے ڈاکٹر شمار کئے جاتے تھے اور ڈاکٹر باسط دونوں علامہ کے معالج تھے۔ علامہ ۵ر فروری (۱۹۳۵ء) کو نذیر نیازی کو بھوپال کی آب و ہوا اور علاج کے سلسلے میں آگاہ کرتے ہیں:

"الحمد للہ[۱] خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ امید ہے کہ اس کا صحت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ طبی معائنہ کل ختم ہوا یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے۔ طبی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہرحال آج گیارہ بجے سے Ultra voilet rays (ماورا بنفشی شعاعوں) کا غسل شروع ہوگا جو ابتداء میں صرف سات منٹ روزانہ ہوگا۔"

۹ر فروری ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال نیازی صاحب کو دوبارہ اپنی صحت اور علاج کے متعلق خبر کرتے ہیں:

"بجلی اور[۲] Ultera voilet Rays سے علاج شروع ہے۔ ایک آدھ ہفتہ کے بعد معلوم ہوگا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہوگا...... بھوپال میں موسم نہایت عمدہ ہے۔ فروری کے آخر تک بلکہ مارچ تک ایسا ہی رہے گا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت

---

[۱] مکتوبات اقبال ۲۵۶ [۲] مکتوبات اقبال ص ۲۵۷

دہلی میں ہیں، ۱۷ فروری کو واپس آئیں گے۔"

جب علّامہ کو خفیف سا فائدہ ہوا تو ۱۳ فروری ۱۹۳۵ء کو پھر تحریر کرتے ہیں:

"..... بجلی[1] کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا۔ اس واسطے آپ ابھی حکیم صاحب والی دوا ارسال نہ کریں۔

موسم بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں اور بہت پُر امید ہیں کہ مہینہ کے اختتام تک نمایاں فرق ہوگا۔ نبض کی حالت اور دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے۔ میں انشاء اللہ اس ماہ کے آخر تک واپس ہونگا، بشرطیکہ کوئی خاص امر مانع نہ ہو۔"

علّامہ اقبال ۸ مارچ کو بھوپال سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں تقریباً سوا مہینے ان کا قیام رہا۔ علاج سے افاقہ کافی ہوا لیکن آواز میں بہت کم فرق پیدا ہو سکا بقول نذیر نیازی صاحب "حسب[2] قرارداد حضرت علامہ ۸ (مارچ ۱۹۳۵ء) کی صبح کو دہلی تشریف لائے۔ صحت نہایت اچھی تھی۔ معالجین بھوپال کو یقین تھا کہ ان کے علاج سے حضرت علامہ کا مرض جاتا رہے گا۔"

چنانچہ علامہ لاہور سے ۱۹ مارچ کو محمد حسین صاحب کو تحریر کرتے ہیں:

"جناب[3] عرشی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہیگا دو ماہ کے وقفے بعد پھر بھوپال جانا ہوگا۔"

شیخ عبد القادر صاحب علّامہ اقبال کی بھوپال میں آمد اور علاج کے سلسلہ میں تحریر کرتے

---

[1] مکتوبات اقبال ص ۲۶۰ [2] مکتوبات اقبال ص ۲۶۳ [3] ملفوظات اقبال ۔ محمود نظامی ص ۲۴۲

که "حیف ہے کہ کچھ عرصہ بعد گلے کی بیماری کی وجہ سے اس آواز کو صدمہ پہنچا کہ مرحوم اپنی عمر کے آخری سالوں میں معمولی بات چیت بھی بہت دھیمی آواز سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب میں لاہور سے انگلستان روانہ ہوا تو اقبال بیمار تھے۔ اسی بیماری کی وجہ سے وہ آکسفورڈ نہ آسکے جہاں انھیں لیکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کو جو اُن کے خاص قدر دانوں میں تھے خیال آیا کہ ان کا معالجہ ہونا چاہیے انھیں اپنے ہاں بلا کر مہمان رکھا اور علاج بھی کرایا جس سے قدرے افاقہ ہوا اور گفتگو میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی۔ مگر گلا پورا درست نہ ہو سکا۔"[۱]

اس مرتبہ جب تک علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں رہا وہ سر راس مسعود کے ساتھ "ریاض منزل" میں رہے۔ جہاں میزبان نے اپنے عزیز مہمان کی آسائش و آرام کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ بیگم سر راس بھی علامہ کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے:[۲]

"...... دورانِ قیام بھوپال انھوں نے (لیڈی مسعود) جو توجہ مجھ پر مبذول کی، میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

بھوپال سے واپسی پر علامہ کی حالت بہتر ضرور تھی لیکن مکمل صحتیابی کے لئے ابھی کافی دیر تھی۔ بہت آہستہ افاقہ ہو رہا تھا کہ اچانک والدہ جاوید کو اپریل (۱۹۳۵ء) میں میعادی بخار آگیا۔ اگرچہ وہ سالہا سال سے بیمار تھیں۔ لیکن یہ بیماری ایسی آئی کہ پھر جاں بر نہ ہو سکیں۔ علامہ اقبال اس زمانے میں بے حد فکر مند رہتے تھے۔ آخر وہ منحوس گھڑی آ ہی گئی جس کا ڈر تھا۔ یعنی ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو اُنھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ اس ناگہانی موت کا

---

[۱] ملفوظات اقبال ص۲۱ [۲] اقبال نامہ حصہ اول ص۳۶۷

علامہ اقبال کے قلب پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے ۲۴ مئی (۱۹۳۵ء) کے خط بنام نذیر نیازی کیا ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے ان کی دلی کیفیات کا پتہ چلتا ہے:

"کل شام والدہ جاوید اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں، ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینان قلب کا، اللہ فضل کرے۔ ہر چہ از دوست می رسد نکوست باقی رہا میں سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی ...... بھوپال نہ جا سکوں گا جبتک بچوں کے لئے کوئی معقول انتظام نہ ہوجائے"[1]

علاّمہ اقبال کی رفیقۂ حیات قبرستان بیبیاں پاکدامنان (ایمرسن روڈ لاہور) میں دفن ہوئیں اور قبر پر اقبال کا یہ قطعہ تحریر کر دیا گیا:

یا حیّ یا قیوم[2]

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینہ پر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمۂ ما زاغ"
۱۳۵۴ھ

علامہ کے لئے یہ زمانہ بڑی دشواریوں اور پریشانیوں کا تھا۔ ایک طرف ان کی اپنی صحت خراب تھی۔ آمدنی کا واحد ذریعہ وکالت تھی جسے عرصے سے چھوڑے ہوئے تھے۔ جو کچھ جمع کیا تھا وہ جاوید منزل کی تعمیر میں خرچ کر دیا تھا۔ البتہ بہت معمولی رقم کتابوں کی فروخت سے آتی تھی جو ناکافی تھی اور جب جاوید منزل منتقل ہوئے تو غالباً دوسرے ہی دن اہلیہ رخصت ہوگئیں (اقبال۔ ص ۳۰) ہاتھ خالی دل رنجیدہ، ذہن پراگندہ اور طبیعت خوددار۔ پریشانیوں کا علاج کس طرح ہوتا۔ ادھر چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ ریکھ اور تربیت کا سوال بھی پیدا ہو رہا تھا، جو اپنی جگہ بڑا اہم تھا۔ چاہتے تو ہزاروں راستے ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے نکل جاتے لیکن ان کی

---

[1] مکتوبات اقبال ص ۲۷۴ [2] ذکر اقبال ص ۱۹۵

بے غرضی، استغنا پسندی اور قلندرانہ شان آڑے آرہی تھی۔

سر راس مسعود علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے اور ان سے بے انتہا خلوص برتتے تھے یہ ان کی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال بار بار بھوپال تشریف لاتے تھے۔ علامہ جب ان حالات سے دوچار ہوئے تو سر راس ان کے لئے بیحد فکرمند رہنے لگے۔ وہ ایسے نازک موڑ پر اپنے عزیز دوست کے لئے کچھ راستہ نکالنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ اس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے، اس لئے انھیں نواب صاحب سے بڑی قربت حاصل تھی۔ وہ اس سلسلہ میں ان کی خاص توجہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کی وظیفہ کے طور پر نواب صاحب کچھ مدد کریں۔ علامہ اقبال کو اس بات کا علم ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ ۲۶ اپریل ۳۵ء کو سر راس مسعود کو جب خط لکھتے ہیں تو اپنے اس ارادہ سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر نوٹ لکھنا چاہتے ہیں۔

"...... آپ[1] نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کو اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لئے ممکن ہوسکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کرلیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کردینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کرسکتا۔

بہر حال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لئے مقدر ہوچکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے ضروری ذرائع

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۵

بہم پہنچا دے گا ....."

۳ مئی ۱۹۳۵ء کے خط میں دوبارہ وہ اپنی اس دیرینہ آرزو یعنی قرآن کریم پر نوٹ لکھنے کے خیال کا اظہار کرتے ہیں: "چراغ سحری ہوں[1] ، بجھا چاہتا ہوں۔ تمنّا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت وطاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اُسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جدا مجد (حضور نبی کریم) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکوں۔"

بہرحال سر راس مسعود کی کوشش بارآور ہوئی اور والیٔ بھوپال ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ ویسے نواب صاحب بھی علامہ اقبال کے مدّاح اور قدرداں تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے پانچسو روپے کا ماہانہ وظیفہ تاحیات علامہ اقبال کے لئے مقرر کیا۔ علامہ ان لوگوں میں تھے جو دوسروں کی معمولی توجّہ اور تعاون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ ان کے احسان مند رہتے تھے۔ چنانچہ وظیفہ کی اطلاع پا کر ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو اپنے دوست سر راس مسعود کو خط لکھتے ہیں اور والیٔ بھوپال کا شکریہ نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ ادا کرتے ہیں: "نوازش نامے[2] کے لئے جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا سراپا سپاس ہوں۔ میری خواہش تو حقیقت میں اس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفر آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دینے کا تمنائی ہے مجھے امید ہے کہ اعلیٰ حضرت کی خدمتِ اندس میں اس مسئلہ کو پیش کر دیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے مراحم خسروانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری آسائش کا اُنھیں اس قدر خیال ہے۔"

پہلی جون کو علامہ اقبال نذیر نیازی صاحب کو بھی وظیفہ کی اطلاع دیتے ہیں اور اپنے

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صہ ۳۶۱۔ [2] اقبال نامہ حصہ اول صہ ۳۶۰

اس ارادہ کو ظاہر کرتے ہیں کہ بقیہ عمر وہ قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کریں گے۔

"اعلیٰ حضرت[1] نواب صاحب نے میری لائف پنشن پانچ (سو) روپیہ ماہوار مقرر کردی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ اُنھوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔"

اسی وجہ سے وہ نواب صاحب کے بیحد شکر گزار تھے کہ اُنھوں نے ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے اسقدر آسانیاں فراہم کردیں۔ چنانچہ وہ ۳۰ مئی کو سر راس کو تحریر کرتے ہیں:

"میں کس[2] زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں اُنھوں نے ایسے وقت پر میری دستگیری فرمائی جب میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدائے تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں کون ہے جو اعلیٰحضرت اور اُن کے دودمان عالی کا ممنون احسان نہیں ہے ؎

دور دستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سنا دیجئے۔ میں خود حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا۔ اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے۔ سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اس مضمون کا ایک خط مجھے لکھدیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار رہیگا اور وہ اس پر فخر کریں گے۔"

علامہ اقبال کو نواب صاحب کے خط کا بیحد انتظار تھا۔ چنانچہ دو ہفتہ بعد ۵ جون کو پھر وہ سر راس کو خط لکھتے ہیں تو اس کے لئے تاکید کرتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات اقبال [2] اقبال نامہ جلد اول ص ۳۶۳

"........ اُمید کہ ضرور احکام متعلقہ پنشن جاری ہو گئے ہوں گے۔ اب مجھے صرف اس خط کا انتظار ہے جس کا ذکر میں نے اپنے گذشتہ خط میں کیا تھا۔ اعلیٰحضرت بمبئی سے واپس تشریف لے آئے ہوں تو وہ خط لکھوا کر بھجوا دیجئے۔"[1]

عبدالرشید طارق اعلانِ وظیفہ کے بعد علامہ سے ملنے اور مبارکباد دینے گئے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

"بھوپال[2] سے وظیفہ کا اعلان ہوا تو ۲ جون (۱۹۳۵ء) کو میں ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرنے گیا۔ وہ وسطی کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ بیحد کمزور اور لاغر ہو گئے تھے۔ نظام کی خاموشی پر جب میں نے اظہار تاسف کیا تو کہنے لگے بھئی وہاں معاملہ اُٹھا تھا اور منظوری ملنے والی تھی، مگر یہاں کے دو آدمیوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ میں حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ کون بدبخت انسان ہو سکتے ہیں۔ اور جب اُنھوں نے نام بتائے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ دونوں مسلمانانِ ہند کی جلیل القدر ہستیاں مانی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب وفات پا چکے ہیں۔ دوسرے سرکاری فرائض کی ادائیگی میں ہوائی جہازوں پر دنیا کے چکر کاٹتے پھرتے ہیں...."

دراصل نواب صاحب نے علامہ اقبال کی ایسے موقع پر مدد کی تھی جب وہ حقیقتاً بڑی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ ادھر حیدرآباد سے امید جاتی رہی تھی۔ اس لئے وہ نواب صاحب کو اپنا بڑا محسن تصور کرنے لگے تھے اور اس عنایت کی شکر گزاری کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات علامہ اقبال کے مزاج میں تھی کہ وہ دوسروں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ سراہتے اور دوسروں کی مہربانیوں کا ہمیشہ احترام کرتے تھے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال وظیفہ محض اس غرض سے حاصل کرنا نہیں چاہتے

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۶۴ [2] ملفوظات اقبال ص ۲۰۱۰

کہ زندگی کے باقی ایام سکون اور اطمینان سے گزار دیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سر راس مسعود کی کوششوں سے جہاں نواب صاحب بھوپال نے پانچسو روپے کا وظیفہ مقرر کیا، اس کے ساتھ سر آغا خاں نے بھی پانچسو روپے دینے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن یہ اقبال کی قلندرانہ شان تھی کہ نواب صاحب کے علاوہ مزید کسی رقم کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ کہہ کر "کہ میری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے پانچسو روپے ماہوار مجھے بہت کافی ہیں۔ اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لئے نواب صاحب کے وظیفہ پر اکتفا کی جائے" (روزگار فقیر ص ۱۶۱) دراصل اقبال کی غیر تمندی، خودداری، عزتِ نفس، اور قلندری کا تقاضہ تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ روپے کے خواہش مند کبھی نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال تو اس شخص کے قدرداں تھے جس کے بارے میں انھوں نے کہا ہے ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

چنانچہ سر اکبر حیدری نے جب نظام کے توشہ خانہ سے ایک ہزار روپے کا چک بھیجا تو انھوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں خواجہ غلام السیدین تحریر کرتے ہیں:

"آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دیا تھا جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎[1]

میرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

---

[1] آندھی میں چراغ صفحہ ۱۳۲

اس شان فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابل ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو جائے ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولتمند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بہ مشکل بھوپال کی کم تر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اوّل تو یہ رقم میری ضروریات کے لئے کافی ہے میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو۔ اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا، یہ تھا غیرتِ فقر کا تقاضہ ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر منصب وجاہ دولت کی خاطر ہر قسم کا "ایثار" کرنے کو تیار رہیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ انھیں سر اکبر حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے۔ اُنھوں نے "یوم اقبال" پر توشہ خانہ حضور نظامِ دکن کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور تواضع کے پیش کی جب وہ چک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا......"

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہِ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اسکو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

دراصل وہ چاہتے تھے کہ اس قدر وظیفہ مل جائے کہ دوسری ضرورتیں پوری ہو جائیں تاکہ صحت یابی کے بعد یکسوئی کے ساتھ دنیا کے سامنے اسلام کا تعارف کرا سکیں۔ چنانچہ عبدالرشید طارق "مئے شبانہ" کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں "پھر میں نے[1] Introduction

---

[1] ملفوظات اقبال صفحہ ۳۱۰

جو وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، کے متعلق تذکرہ TO THE STUDY OF QURAN
چھیڑا تو فرمانے لگے، ہاں ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کر دوں گا۔ چاہتا ہوں کہ پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضل دیوبند میسّر آجائے، مجھے حوالجات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے۔ انگریزی سے واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے۔ میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں ایک بار کتاب شروع کی تو ان شاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام Theories (نظریات) کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے کہ قانون کے تمام کتب بیچکر فقہ، حدیث اور تفاسیر خرید کر دوں، یہ اب میرے کس کام کی ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی بھی جاتا تو اس کتاب کی بابت استفسار کرتا وہ ہمیشہ خدا سے صحت کی دعا کرتے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال اس کتاب کو لکھنے کے لئے کس قدر بےچین تھے اور اپنی صحت یابی کے اس لئے بھی خواہاں تھے کہ ہر ممکن طریقہ سے کتاب مذکور وجود میں آجائے تاکہ اسلام سے متعلق یورپ کے نظریات باطل ثابت ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی قانونی کتابیں بھی بیچ دینا چاہتے تھے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں اسلام سے کس قدر محبت تھی۔ عبدالمجید سالک صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر سے بھی ان کے اسی قسم کے جذبے کی عکاسی ہوتی ہے۔

"اواخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا، جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی سے متعلق قائم کر رکھے ہیں وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the study of Quran بتایا کرتے تھے۔[1]

ایک دفعہ یہ ارادہ ہوا تھا کہ جس نیٹشے نے Thus spake Zara —

---

[1] ذکر اقبال صـ ۲۱۲

thustra (زرتشت نے یوں کہا) لکھ کر بعض حقائق کو نہایت دلآویز پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ اس طرح علامہ بھی ایک کتاب لکھیں ——

"The Book of Tunknown Prophet"

"(ایک گمنام نبی کی کتاب)۔"

۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ انجمن کے اجلاس میں اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال شریک ہوں۔ چنانچہ دورانِ قیام بھوپال نواب صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ نواب صاحب نے لاہور کی دعوت کو اس شرط پر قبول کیا کہ اگر انگلستان جانا نہ ہوا تو لاہور کے اجلاس میں شریک ہونگے۔ علامہ اقبال بھوپال کی واپسی پر سر راس مسعود کو ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء لاہور سے تحریر کرتے ہیں:

"..... میرا[1] خیال ہے اعلیٰ حضرت کی لاہور کی تشریف آوری کے لئے ۲۱ اپریل موزوں ہوگی۔ ۲۰ اپریل کو تو گورنر اجلاس میں رسمی شمولیت فرمائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۲۱ اپریل تمام تر اعلیٰ حضرت اور مسلمانانِ پنجاب کے لئے ہی مخصوص ہے اگر اعلیٰ حضرت انگلستان تشریف نہیں لے جا رہے ہیں تو اس انتظام کی طرف توجہ کیجئے۔ امید ہے اعلیٰ حضرت کے لئے ایک علیحدہ دن مخصوص کرانے میں میری منشاء کو آپ نے پا لیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ قطعی طور پر طے پا گیا ہے کہ اعلیٰحضرت عازم انگلستان نہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو تار کے ذریعہ اطلاع دیں۔ اور یہ اطلاع بھی بذریعہ تار ہی دیجئے کہ ۲۱ اپریل اعلیٰ حضرت کو منظور ہے۔ معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے۔"

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۵۳

۲۹ مارچ (۶۳۵) کو پھر سر راس مسعود کو اسی سلسلہ میں خط لکھتے ہیں :

" اس امر کی اطلاع آپ نے نہیں دی کہ آیا ہز ہائینس جلسۂ انجمن میں جلوہ افروز ہوں گے اور مجھ سے ہز ہائینس نے خود فرمایا تھا کہ انگلستان نہ گئے تو ضرور تشریف لائیں گے ۔ یہاں اس خبر سے جوشِ مسرت کی کچھ انتہا نہ رہی ۔ مہربانی کرکے مطلع فرمایئے کہ آیا ہز ہائی نس ولایت تشریف لے جائیں گے ......"

" جب سے میں بھوپال سے واپس آیا ہوں لوگ زمینوں سے متعلق دریافت کرتے ہیں ۔ میرے پاس کوئی ان شرائط کی کاپی نہیں ہے جن کے مطابق اراضی دیجاتی ہے "

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ نواب صاحب بھوپال لاہور تشریف لے جاسکے یا نہیں ۔ لیکن علامہ اقبال سے تعلق ہی کے بناء پر نواب صاحب نے مجوزہ زنانہ یونیورسٹی کو اپنے نام نامی سے منسوب کئے جانے کی اجازت دیدی تھی ۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں جب نواب صاحب لاہور تشریف لے گئے تو انجمن حمایت اسلام لاہور کے استقبالیہ سپاسنامہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے ۔

" آج سے کم وبیش سات سال پہلے حضرت حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کے زمانہ صدارت انجمن میں ہماری عاجزانہ استدعا پر حضور والا نے مجوزہ زنانہ یونیورسٹی کو اپنے نام نامی سے منسوب کئے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی "

علامہ اقبال کے دل میں نواب صاحب کی اعلیٰ صفات کی بناء پر بیحد قدر تھی ۔ چنانچہ نواب صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلری کے عہدہ سے استعفا دے دیا تو علامہ بیحد متفکر ہوئے ۔ وہ نواب صاحب کے استعفے کے حق میں نہیں تھے ۔ اس واقعہ کے بعد ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو وہ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں :

لہ اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۵۴   ۲ لہ ندیم جشن سالگرہ نمبر ۱۹۴۳ء

"یونیورسٹی[1] کا چانسلر اب کون ہوگا - کاش اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اپنے استعفیٰ پر دوبارہ غور فرما سکتے لیکن شعیب صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ اس کا کوئی امکان نہیں - یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ لارڈ ویلنگڈن نواب صاحب کو استعفیٰ پر مکرر غور کرنے پر ضرور مائل کریں گے"

"مجھے اطلاع دیجئے کہ اعلیٰ حضرت کا اس سلسلے میں کیا ارادہ ہے"

سر راس مسعود کو ایک دوسرے خط میں اس سلسلے میں اپنے اقدام سے دوبارہ آگاہ کرتے ہیں۔

"......میں[2] اور چند دوسرے احباب اعلیٰ حضرت کے استعفے کے متعلق ایک بیان اورینٹیل پریس مین بھیج رہے ہیں - میرے متعلق آپ کی جو تجویز[3] ہے اس کا سرا آج مجھے انجام کار مل ہی گیا - مجھے یہ اطلاع ایک بھاولپوری دوست کے معرفت ملا ہے اور یہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب بھوپال نے ایک خط لکھا ہے اس خط کے مضمون سے بھی مجھے تھوڑی بہت آگاہی ہوئی ہے - کیا میری اطلاع درست ہے ؟ اس خط کا جواب موصول ہو جانے پر میں اس مسئلہ میں اپنی رائے آپ پر ظاہر کر سکوں گا..."

علامہ اقبال کو نواب صاحب بھوپال سے جو کچھ تعلقات تھے اس پر روشنی اس سپاسنامہ سے بھی پڑتی ہے جو انجمن حمایت اسلام لاہور نے بتقریب نصب سنگ بنیاد زنانہ اسلامیہ کالج لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو تحریر کیا تھا۔

" عالی نژاد

حکیم الامت علامہ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمہ نے ۱۹۳۶ء میں جب "ضرب کلیم" حضور کی خدمت میں پیش کی تو ایک مختصر لیکن جامع پیشکش میں حضور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ؎

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۳۵۹ [2] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۵۵ [3] اقبال فنڈ کی طرف اشارہ ہے

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیرِ من است

دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند

"اس پیشکش کے اکثر پڑھنے والوں کو ملت اسلامیہ کے کئی اُن مقاصد سے آگاہی تھی جن کے حصول کی فکر اس ترجمان حقیقت کے قلب کو ہر وقت بیقرار رکھتی تھی لیکن یہ حقیقت پہلی دفعہ واضح ہوئی کہ فرمانروائے بھوپال اقبال کے نزدیک وہ "صاحب نظر" ہے جس کا دل سب کچھ دیکھتا ہے اور جس کا اندیشہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو اقبال کے ضمیر میں ہے "پیشکش" کے پہلے شعر میں اس داستان کی طرف اشارہ تھا جو زمانہ کی ان بوالعجبیوں پر مشتمل تھی جس سے امم ایشیا کو دوچار ہونا پڑا ......"

"اس پیشکش سے قریبًا پندرہ سال قبل حکیم الامت نے "مخدرات اسلام" کو خطاب کرتے ہوئے اُن بوالعجبیوں کے ایک گوشے کو "رموزِ بے خودی" میں یوں بے نقاب کیا ہے ؎

اے ردایت پردۂ ناموس ما — تابِ تو سرمایۂ فانوس ما

دورِ حاضر تر فروش و پُر فن است — کاروانش نقدِ دیں را رہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراکِ او — ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ او

چشم اُو بیباک و ناپروا ستے — پنجۂ مژگانِ او گیرا ستے

صیدِ او آزاد خواند خویش را — کشتۂ او زندہ داند خویش را

....

از سرِ سود و زیاں سودا مزن — گام جز بر جادۂ آبا مزن

دورِ حاضر کی "تر فروشی" اور "پُر فنی" کے خلاف اس انتباہ کی مخاطب "مخدراتِ اسلام" تھیں لیکن اس آوازۂ حق سے تمام ملت اسلامیہ کو ایک گہری نیند سے جگایا گیا

اور اسے آگاہ کیا گیا کہ دختران ملت کی تعلیم و تربیت سے ہماری غفلت اس حد تک بڑھی ہے کہ غیر اسلامی اثرات سے اب ان کو بھی گرفت میں لیا چاہتے ہیں وقت ہے کہ ان کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی جائے۔ اس سے چند سال بعد جو چارۂ کار خود حکیم الامت کی بصیرت نے تجویز کیا وہ یہ تھا کہ نساء اسلام کے لئے قرآنی معارف تہذیب اور دور حاضر کے ضروری اور قابل استفادہ علوم و فنون کی ایک مستقل یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس مقصد کے اجراء و تکمیل کے لئے زمان فرمایان کی روایتی معارف پروری کے پیش نظر حضور والا کی ذات عالی صفات کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام ۱۹۳۶ء میں بوساطت سر راس مسعود مرحوم انجمن کی اس تجویز کو حضور پُر نور کے گوش گزار کیا گیا۔ ابھی اس تجویز کا عملی خاکہ زیر نظر تھا کہ ایک گلوگیر مرض جس کے علاج کا ہر ممکن چارہ کرنے کے لئے خود حضور متفکر رہے اور ایک سے زائد بار اس غرض کے لئے علامہ کو دار الاقبال بھوپال میں یاد فرمایا۔ بالآخر اپریل ۱۹۳۸ء ان کے جسد عنصری پر غالب آگیا اور وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہ گئے"

"جس تجویز کو اقبال کے دماغ نے اختراع کیا اور جسے اس نے "صاحب نظر" بھوپال کے گوش ہمایونی تک بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام پہنچایا، انجمن کا فرض تھا کہ اگر کلاً نہیں تو جزواً اسے قوت سے فعل میں لانے کے لئے اپنی بساط کے مطابق کوئی عملی تدبیر اختیار کرے" (ندیم جشن سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء)

علامہ اقبال دوسری مرتبہ بغرض علاج ۱۷ جولائی ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لائے چنانچہ وہ سر راس مسعود کو ۲۴ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور سے لکھتے ہیں

"آپ کا خط مل گیا اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی موصول ہو گیا ہے۔ جسے میں نے

سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوادیا ہے......

میں انشاء اللہ وسط جولائی تک بھوپال پہنچوں گا۔ جاوید کو ہمراہ لانا ہوگا۔ علی بخش بھی ہمراہ ہوگا۔ شعیب صاحب کو بھی اپنے آنے کی اطلاع دے دوں گا۔ مگر یہ تو بتلایئے کہ میرا ایڈریس بھوپال میں کیا ہوگا تاکہ میں گھر میں وہ ایڈریس چھوڑ جاؤں۔ اس طرح بچی منیرہ کی خیریت مجھے روز ملتی رہے گی۔ جس جگہ مجھے ٹھہرنا ہوگا اُس جگہ کا پتہ لکھ دیجئے۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے کے واسطے تڑپ رہا ہوں۔" (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۶۵)

۱۱رجولائی کو نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں:

"میں[1] دو چار روز تک بھوپال جاؤں گا اور قریباً ڈیڑھ ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ شاید اب تک چلا جاتا مگر بارش نہیں ہوئی۔ برسات شروع ہو جائے تو جاؤں"

عبدالمجید سالک "ذکر اقبال" میں تحریر کرتے ہیں کہ "۱۵[2] رجولائی کو علامہ نے پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا تاکہ برقی علاج جاری رہے۔"

نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ "۱۶[1] ر(جولائی ۱۹۳۵ء) کی صبح کو حضرت علامہ (فرنٹیر میل) دہلی تشریف لائے میں اسٹیشن پر موجود تھا۔ شام کو بھوپال روانہ ہوگئے۔"

۱۷رجولائی کو علامہ اقبال بھوپال پہنچے اور برقی علاج پھر شروع ہوا۔ ۱۹رجولائی کو علامہ سید سلیمان ندوی کو آگاہ کرتے ہیں کہ "میں گلے کے برقی علاج کے لئے کچھ مدت کے لئے بھوپال میں مقیم ہوں۔"

یکم اگست کو اپنی صحت کی بہتری کا اظہار نذیر نیازی صاحب کے خط میں کیا۔ یہ خط شیش محل سے لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جلد ہی وہ ریاض منزل چھوڑ کر شیش محل

---

[1] مکتوبات اقبال۔ نذیر نیازی۔ [2] ذکر اقبال ص ۱۹۶

میں منتقل ہو گئے تھے " میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ الحمد للہ اگر آپ لاہور سے واپس آ گئے تو اطلاع دیں "

علامہ اقبال ۱۰ اگست کو بھوپال سے اپنی صحت کی بہتری کے بارے میں بھی اطلاع دیتے ہیں "صحت خوب ترقی کر گئی ہے۔ آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے اب کے علاج سے فائدہ ہو گا۔ شاید ایک دفعہ اور بھوپال آنا پڑے گا۔ یعنی اس ہفتہ بعد ...... میں غالباً ۲۶ / یا ۲۸ / اگست کو یہاں سے روانہ ہونگا "[2]

اس سفر میں بھی علامہ کا قیام کچھ دنوں تک " ریاض منزل " بھوپال میں رہا۔ جہاں سر راس مسعود اور بیگم مسعود ان کے میزبان تھے۔ دونوں علامہ اقبال کا ہر طرح خیال رکھتے تھے اور ان کی دیکھ ریکھ اور سکون و آرام میں کسی قسم کی کمی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ نذیر نیازی صاحب " علامہ اقبال کی آخری علالت " میں بیان کرتے ہیں۔[3] " سر راس مسعود ان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتے کہ خود حضرت علامہ کو تعجب ہوتا۔ انھوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب انھیں پیٹھ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصل سبب ضعف قلب ہے۔ لہذا انھیں چاہئے کہ نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں " ریاض منزل " میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا میں جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے تاکہ زینہ پر چڑھنے میں مجھے تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر میں نے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی میں نے کہا: آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ انھوں نے " کوئی بات نہیں " کہہ کر ٹال دیا " حضرت علامہ کہتے ہیں اسی دن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے

---

[1] مکتوبات اقبال صـ۲۸۰ [2] مکتوبات اقبال صـ۲۸۳ [3] اقبال انجمن ترقی اردو صـ۳۰۸

دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں آرام سے لیٹے رہیئے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے بتلایا کہ "ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے" اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سر راس مسعود کے خلوص و محبت کا ان کے دل پر کیا اثر ہوگا۔"

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں لکھتے ہیں کہ "بھوپال سے واپسی پر علامہ بتایا کرتے تھے کہ آواز میں خفیف سی ترقی ہے۔ اگر پانچ چھ مزید کورس علاج کے پورے ہو گئے تو آواز کھل جائیگی لیکن نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ "بھوپال[۱] سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کی صحت ایک خاص نقطے پر آ کر رک گئی...... بھوپال سے واپس آ کر انھیں ایک حد تک کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ درست ہے کہ اس بار بھوپال سے واپسی پر علامہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہو سکے تھے البتہ مرض میں کسی قدر افاقہ تھا۔ اس لئے وہ وائنا جانے کے سلسلہ میں سر راس مسعود سے ۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں مشورہ لیتے ہیں "میرے[۲] ایک دوست جو یہاں (لاہور) کے سادات میں سے ہیں اور مرض ذیابیطس کے پرانے بیمار تھے۔ حال میں تندرست ہو کر وائینا (آسٹریا) سے واپس آئے ہیں اور وہ بیان کرتے ہیں کہ دوران علاج میں انھوں نے اپنے ڈاکٹروں سے میرے مرض کا ذکر بھی کیا تھا۔ جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آ جائے تو میں گارنٹی کرتا ہوں کہ وہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر وائنا جانے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤں۔ آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ فی الحال میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی قدرے امپروومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے جو فوٹو میرے سینہ کا لیا تھا اسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن وائنا بھیجنے والے تھے معلوم نہیں ابھی تک بھیجا ہے کہ نہیں۔ میں نے

۱؎ اقبال - انجمن ترقی اردو ص ۳۰۹ ۲؎ اقبال نامہ ص ۳۷۱

ڈاکٹر صاحب (عبدالباسط) کو خط لکھ کر دریافت کیا ہے وہاں سے اکسپرٹ اوپینیں آجانے پر آخری فیصلہ کروں گا۔ فی الحال آپ کی رائے چاہتا ہوں۔"

جشن صد سالہ ولادت حالیؔ

۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں "جشن صد سالہ ولادت حالی" منایا گیا اس کی صدارت والئ بھوپال نے کی۔ علامہ اقبال نواب صاحب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اس لئے وہ بھی اس جشن میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اس کی اطلاع وہ نذیر نیازی کو بھوپال سے (۱۲ اگست) اس طرح دیتے ہیں: "مولانا حالی کی سینٹینری اکتوبر (۱۹۳۵ء) آخر میں ہوگی۔۔۔۔۔سینٹینری پانی پت میں ہوگی، اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے میں بھی پانی پت میں اس موقع پر پہنچ جاؤں گا۔"[۱]

علامہ اقبال اپنے پروگرام کے مطابق پانی پت نواب صاحب سے ایک روز قبل پہنچے نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ "اکتوبر[۲] ۱۹۳۵ء میں جب خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو میں پانی پت اُس وقت پہنچا جب منتظمین جلسہ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لے آئے تھے۔۔۔۔۔۔ اگلے روز والی بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرت علامہ نے بھی شرکت فرمائی۔"

حضرت علامہ اقبال جلسہ میں شریک ضرور ہوئے لیکن چونکہ گلے میں تکلیف تھی! اس لئے وہ نظم جو انھوں نے اس موقع کے لئے تحریر کی تھی، نہ سنا سکے بلکہ اسے کسی دوسرے نے پڑھ کر سنائی۔ نظم درج ذیل ہے۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم   چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر کردم

---

[۱] و [۲] مکتوبات اقبال صفحہ ۳۴۶

حمید اللہ خاں اے ملک ملت را فروغ از تو | ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را | نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازیم | تو بر خاکِ گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی مرتب "یادگار غالب" تحریر کرتے ہیں کہ اس موقع پر نواب صاحب نے حالی میموریل اسکول کے لئے بیس ہزار روپے عنایت کئے تھے اور علامہ اقبال نے اس وقت یہ قطعہ کہہ کر خراج تحسین ادا کیا تھا

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دیدہ بیفسرد | سید دیگر او رانمی از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود | تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

نواب صاحب اسی دن پانی پت سے روانہ ہوگئے۔ علامہ نے بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا قیام مناسب نہ سمجھا اور ہر چند کہ لوگوں نے روکنا چاہا، وہاں سے رخصت ہوئے۔

۹ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور واپسی کے بعد علامہ کو جلد ہی بھوپال لوٹنا تھا۔ تاکہ مکمل صحتیابی ہو جائے لیکن سردی اور پھر ایک ایرانی الاصل سیدزادے کے علاج کی وجہ سے آواز بہتر ہوتی جا رہی تھی اس لئے چند روز کے لئے بھوپال کا جانا ملتوی ہوگیا، اب وہ جنوری (۳۶ء) کے آخر میں بھوپال آجانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ۱۷ جنوری ۳۶ء کو وہ نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ "میں[1] جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتہ میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں"۔

پھر ۲۸ جنوری ۳۶ء کو تحریر کرتے ہیں "میرا[2] حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے

---

[1] مکتوبات اقبال صفحہ ۲۱۶ [2] مکتوبات اقبال صفحہ ۲۱۶

انشاءاللہ وسط فروری میں بھوپال جانے کا قصد ہے۔"

۱۹ر فروری ۳۶ء کو بھوپال جانے کے پروگرام سے نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں۔ "میں[۱] بھی خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں ۲۸ر فروری یا یکم مارچ کو بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔ جاتی دفعہ دہلی نہ ٹھیروں گا۔ انشاءاللہ بھوپال سے واپسی پر تنصل خانے میں ایک آدھ روز قیام رہے گا کہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں ...... ارادہ یہ ہے کہ تمام دن دہلی اسٹیشن پر ہی ہونگا۔ وہاں سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال روانہ ہو جاؤں گا۔"

۲۵ر فروری کو صحیح روانگی کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں: "میں[۲] یہاں سے ۲۹ر فروری کی شب کو فرنٹیر میل سے چلوں گا یا دوسری ٹرین میں جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچکر دن بھر وہیں قیام کروں گا۔ ۴۔۵ بجے بعد دوپہر جو ٹرین دہلی سے بھوپال کی طرف جاتی ہے اس میں سوار ہو کر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا۔"

علامہ اقبال حسب پروگرام دہلی پہنچے۔ قیام کچھ دیر ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ دیر تنصل خانے میں رہا۔ تیسرے پہر بھوپال روانہ ہو گئے۔ یہ سفر بھی علاج کے لئے تھا۔ اگرچہ سر راس سے ملاقات کا پہلو بھی شامل تھا۔

طلوع اسلام

اسی زمانے میں یہ رسالہ طلوع اسلام دہلی سے جاری ہوا تھا۔ اس کا نام علامہ اقبال کی نظم "طلوع اسلام" کی نسبت سے رکھا گیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دو شمارے ۱۹۳۶ء میں دہلی ہی سے نکلے۔ علامہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے اس رسالہ کو نواب صاحب بھوپال سے مدد مل جائے۔ چنانچہ وہ نذیر نیازی صاحب کو ۸ مارچ ۳۶ء کو ایک خط اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۱۶ ۲۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۵

"ڈیر نیازی صاحب ۔ السّلام علیکم

امید ہے کہ یہ خط آپ کو دہلی میں مل جائے گا۔ آپ ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت کے نام رسالہ "طلوع اسلام" کی مدد کے لئے لکھئے اور تینوں رسالے بھی ان کے نام ارسال کر دیجئے۔ عرضداشت میں رسالے کے اغراض و مقاصد اور اس کا نصب العین عمدہ الفاظ میں بیان کیجئے۔ نیز یہ بھی لکھئے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والاصفات کے اور کون ہے۔ یہ عرضداشت میرے نام ارسال کیجئے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ کر سید راس مسعود کے پاس بھیج دوں۔"[1]

جب یہ خط نذیر نیازی صاحب کو ملا تو ان کا بیان ہے کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اعلیٰحضرت سے کس بنا پر "طلوع اسلام" کی امداد کے لئے درخواست کروں۔ عرضداشت کا مضمون بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ احباب سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا یہ دربار داری کے معاملات ہیں تم ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکو گے۔ ویسے حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔

بہرحال جوں توں کر کے ایک عرضداشت مرتب کی لیکن گھر بار چونکہ علامہ اقبال کے ایما پر لاہور منتقل ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس کی ترسیل میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ حضرت علامہ نے مجھے خاموش پایا تو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ کو خط لکھا۔"

مکتوب اقبال بنام سید سلامت اللہ حسب ذیل ہے

"معلوم نہیں نیازی صاحب لاہور پہنچے یا نہ پہنچے۔ میں نے جو خط ان کو لکھا تھا اس کا کوئی جواب[2] انھوں نے نہیں دیا۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ "طلوع اسلام" کی مدد کے لئے ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کے نام لکھ کر میرے نام فوراً ارسال کر دیں۔ عرضداشت کا مضمون بھی میں نے اس خط میں لکھ کر دیا تھا۔ وہ اب تک خاموش ہیں۔ اگر انھوں نے تساہل کیا تو معاملہ

---

[1] مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۷ [2] مکتوبات اقبال ۳۲۸

دوسرے سال پر پڑ جائے گا۔ اس وقت بجٹ تیار ہو رہا ہے۔ اگر وہ فوراً عرضداشت بھیج دیں تو کام اسی سال ہو جائے گا۔ جہاں کہیں بھی ہوں ان کو تاکید کر دیں کہ عرضداشت مذکور عمدہ کاغذ پر خوشخط لکھ کر فوراً ارسال کر دیں۔ عرضداشت میں اعلیحضرت کو ایڈریس کیا جائے اور میرے پاس بھیجا جائے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ سکوں۔"

نذیر نیازی صاحب نے حسب ارشاد علامہ عرضداشت بھیجدی جس کی رسید ۳۱ مارچ کو علامہ نے دی۔

"آپ کی عرضداشت پہنچ گئی ہے۔ میں انشاءاللہ ۹ اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچوں گا۔" (م - ا) ص ۳۲۹

جناب نذیر نیازی علامہ اقبال کے بھوپال کے اس آخری سفر میں ایک خواب کا واقعہ اسطرح بیان کرتے ہیں:

"حضرت علامہ[1] فرماتے ہیں "میں بھوپال ہی میں مقیم تھا جب ایک روز خواب میں دیکھا جیسے سر سید احمد خاں مرحوم کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے۔ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا ؎

با پرستان شب دارم ستیز   باز روغن در چراغ من بریز

پھر جب چند اشعار حضور صلعم کے عرض احوال میں ہوئے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان اور بیرونی ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے حضرت علامہ کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مثنوی کی شکل اختیار کر لی۔"

۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال لاہور واپس لوٹے یہی ان کا بھوپال کا آخری سفر تھا۔

---

[1] علامہ اقبال کی آخری علالت ص ۳۱۱

"ضربِ کلیم" کی اشاعت جولائی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ اقبال کے اس مجموعے میں مندرجہ ذیل وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے بھوپال میں ریاض منزل اور شیش محل کے دوران قیام میں کہیں۔

(۱)	صبح	شیش محل	(۸)	حکومت	ریاض منزل
(۲)	سلطانی	ریاض منزل	(۹)	نگاہ	" "
(۳)	تصوف	" "	(۱۰)	امید	" "
(۴)	وحی	" "	(۱۱)	ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام	شیش محل
(۵)	مومن	شیش محل			
(۶)	امرائے عرب سے	" "	(۱۲)	جمعیت اقوام مشرق	شیش محل
(۷)	مقصود	ریاض منزل	(۱۳)	مسولینی (۲۲ اگست ۱۹۳۵ء)	" "

علامہ اقبال نے اس مجموعہ کا انتساب نواب حمید اللہ خاں کے نام مندرجہ ذیل اشعار کے ساتھ کیا:

اعلیٰ حضرت نواب سر محمد حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں

زمانہ با اممِ ایشیا چہ کرد و کند — کسے نبود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحب نظری آنچہ در ضمیرِ من است — دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من — "کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند"

یہ شعری مجموعہ جب شائع ہوا تو اس کی چھ کاپیاں بھوپال بھیجی گئیں جس کی تفصیل سے علامہ نے سر راس مسعود کو اس طرح آگاہ کیا:

"آج میرے[1] منشی طاہر دین آپ کی خدمت میں 'ضرب کلیم' کی چھ کاپیاں ارسال کر رہے ہیں

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۳۷۸

ان میں سے ایک کاپی آپ کی ہے اور باقی خاندان شاہی کے لئے۔ ایک اعلیٰحضرت کے لئے۔ ایک شہزادی ولیعہد کے لئے اور دو اعلیٰ حضرت کے بھتیجوں کے لئے۔

اعلیٰ حضرت کے لئے جو کاپی ہے اس پر میرا نام کتاب کے صفحہ پر ڈیڈیکیشن کے اشعار کے نیچے لکھا ہے کوئی اور کاپی مطلوب ہو تو اطلاع دیجئے

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ شاید سردیوں میں بھوپال آسکوں۔"

پھر ۲۷ اگست کے خط میں مزید کاپیاں بھیجنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور سر راس مسعود کو اس سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ نواب صاحب نے "تلطف آمیز" خط لکھا ہے اور ضرب کلیم کی نظموں کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے: "امید[1] ہے کہ کل تک اور عمدہ جلدیں بن کر آئیں گی تو انھیں ارسال کروں گا۔ مطمئن رہیے۔ مجھے یاد ہے بھولا نہیں ہوں۔ اعلیٰحضرت کا خط بھی نہایت تلطف آمیز تھا جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام۔"

علامہ اقبال نے اس مجموعۂ نظم کو نواب صاحب بھوپال کے نام انتساب کیوں کیا اسے لوگ جس انداز میں چاہیں سوچیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اس انتساب کے ذریعہ نواب صاحب سے دیرینہ دوستانہ تعلقات اور ان کے اس احسان کا جو انھوں نے ان کی بیماری کے وقت وظیفہ کی صورت میں کیا تھا، اظہار تشکر کیا ہے۔ چنانچہ یوسف سلیم چشتی تحریر کرتے ہیں: "میں نے اس انتساب کی علت پر بارہا غور کیا، لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم فطرتاً بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ مجھے ان کی خدمت میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک حاضری کا موقع ملا اور میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تھا تو وہ ہمیشہ اس کا

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صـ۳۸ [2] شرح ضرب کلیم صـ۱۸

تذکرہ شکر گزاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھے ۔ چونکہ نواب صاحب بھوپال نے ان کی آخری علالت میں ان کے ساتھ بہت حسن سلوک روا رکھا تھا اور علمی وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کا بدل اس رنگ میں کیا کہ " ضرب کلیم " کے ساتھ ان کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دیا اور میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اُنھوں نے نواب صاحب موصوف کے احسانات کا نعم البدل کر دیا "

علامہ اقبال " ارمغان حجاز " بھی نواب صاحب کے نام انتساب کرنا چاہتے تھے ـــــ اُنھوں نے سر راس مسعود کو تحریر کیا تھا " ...... انشاءاللہ امید کہ سال (آئندہ) حج کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ ساتھ لاؤں گا کہ مسلمان ہند یاد کریں گے ۔ یہ تحفہ بھی اعلیٰ حضرت کی نذر کیا جائے گا

خدائے تعالیٰ اُنھیں عمر دراز عطا فرمائے .... فروری یا مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے ۔ ممکن ہوا تو چند روز کے لئے بھوپال آؤں گا "

لیکن ان کی وفات نے اس خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا ۔ شیخ عطاء اللہ مرتب اقبال نامہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں ۔ " اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی ملّت پرورانہ توجہات عالی کا جو احسانمندانہ اعتراف کیا ہے وہ اقبال ہی نہیں تمام ملت پر فرض ہے ۔ اقبال نے ـــــ زالطافِ تو خیزد موجِ لالہ از خیابانم

کہہ کر اس حقیقت کا اظہار فرمایا اور " ضرب کلیم " کے انتساب میں

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من   کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

فرما کر اپنا فرض ادا کیا لیکن اقبال کی احسانمندی کا حال یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنی کتاب " ارمغان حجاز " بھی نواب صاحب ہی کی نذر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی اطلاع انھوں نے

---

[۱] اقبال نامہ حصّہ اول صفحہ ۳۸۲

سر راس کو دی تھی۔ سر راس مسعود، اقبال سے پہلے فوت ہو گئے اور "ارمغان حجاز" اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی اس طرح اقبال کی اس خواہش و وعدے کا جو ایک گونہ وصیت کا حکم رکھتا ہے کسی کو علم نہ ہوا۔ اس مجموعۂ مکاتیب کی اشاعت کے بعد امید قوی ہے کہ اقبال کی اس خواہش کی تعمیل کی جائے گی" (دیباچہ)

اقبال سے راس مسعود کا بڑا گہرا قلبی لگاؤ تھا اور یہی حال اقبال کا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ بھوپال میں علامہ کی آمد اور ریاض منزل میں قیام کی وجہ بھی یہی تعلق تھا۔ بھوپال میں ان کا قیام زیادہ تر ریاض منزل یا شیش محل میں رہا۔ جہاں اکثر بات چیت کی محفلیں جمتی تھیں۔ بیگم سر راس بھی آپس کی گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ سر راس کو علامہ کے اشعار بہت پسند تھے اس لئے ان کے کلام کا بڑا حصہ انھیں از بر تھا۔ یہی حال بیگم سر راس کا بھی تھا۔ چنانچہ "ایک بار[1] ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود ایک محفل میں جمع تھے۔ راس مسعود کی طبیعت کو جو چہل سوجھی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے بولے کہ آج ہم دونوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ رہے گا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ آج ہم اشعار شاعر مشرق ہی کے سنائیں گے کسی دوسرے شاعر کے اشعار قبول نہیں کئے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عزیز دوست کی فرمائش اور شرط کو مان لیا۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا اور دس بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شروع شروع میں تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے اشعار سنائے مثلاً سر راس مسعود کا کہا ہوا شعر "ل" پر ٹوٹتا اور ڈاکٹر صاحب نے فوراً اپنا ایسا شعر سنایا جسکی ابتدا "ل" سے ہوئی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے شعر سنانے کی رفتار دھیمی پڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے شعر یاد کرنے میں بڑی تلاش اور غور و فکر سے کام لینا پڑا۔ مگر

---

[1] روزگار فقیر صفحہ ۱۵۷

سر راس مسعود کے حافظہ اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ وہ پوری روانی کے ساتھ علامہ اقبال کے اشعار سنائے جاتے تھے اور کسی طرح ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ اپنے دوست سر راس مسعود کے حق ہی میں دیا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ انھیں اپنے اشعار اتنے یاد نہیں ہیں جتنے راس مسعود کو یاد ہیں اور وہ (اقبال) ان (راس مسعود) کے حاضر جوابی برجستہ گوئی اور اقبال شناسی کے آگے سپر انداختہ ہیں۔ ع

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

عبدالرزاق کانپوری بیان کرتے ہیں کہ اقبال کے متعلق سر راس کا خیال تھا کہ[۲] "وہ حقیقی معنیٰ میں شاعر ہے اور محض شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر اور فلسفی بھی" (یاد ایام ۳۸۴) اور اسی طرح علامہ اقبال سر راس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "ان کا دماغ انگریز کا اور دل سچے مسلمان کا ہے" (روزگار فقیر۔ ص ۱۵۴) علامہ نے مختلف موقعوں پر اس جملے کو دہرایا۔ جس کے جواب میں سر راس نے ایک بار کہا کہ "اقبال[۱] غنیمت ہے کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں ہے"

بھوپال میں ایک بار کسی محفل میں اقبال پر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ فارسی شعراء کے خیالات اپنی زبان سے پیش کرتے ہیں تو سر راس اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن جب کسی نے اقبال کا یہ مصرعہ پیش کیا۔ ع

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

اور[۲] ساتھ ہی عرفی کا وہ شعر پڑھا جس کا یہ مصرعہ لفظی ترجمہ ہے تو سید صاحب خاموش ہو گئے اس کے بعد مائل (نقوی) نے متعدد فارسی اشعار متقدمین شعراء کے سنائے جن کا اقبال نے چربہ اُتارا تھا، تو آخیر میں یہ فیصلہ کیا کہ مضامین تصوف میں اقبال نے ضرور متقدمین کے خیالات سے

---

[۱] روزگار فقیر ص ۱۵۴ [۲] یاد ایام صفحہ ۳۸۶

فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ سرقہ نہیں ہے صرف تتبع ہے۔

لیڈی مسعود بھی علامہ کی شاعری سے بڑی دلچسپی رکھتی تھیں ان کا شعری ذوق بڑا صاف ستھرا تھا۔ سر راس اور بیگم مسعود دونوں اقبال کی عظمتوں سے آگاہ تھے اور اُن سے محبت رکھتے تھے بیگم مسعود کا بیان ہے کہ اقبال اکثر کہا کرتے تھے ۔ "انگریزوں نے[1] اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے"

علامہ اقبال کی کتاب بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تو اُنھوں نے ایک جلد اپنے دستخط کے ساتھ سر راس مسعود کو دی۔ بیگم مسعود اس وقت موجود تھیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا ۔۔ "ڈاکٹر صاحب[2] آپ کا کلام اُن سے بہتر میں سمجھتی ہوں اور کتاب آپ اُن کو عنایت فرما رہے ہیں"

ڈاکٹر صاحب اس فقرے سے لطف اندوز ہوئے اور فرمایا: "میں[3] اپنا شعر سناتا ہوں تم میں سے جو کوئی اس کی زیادہ صحیح اور بہتر تشریح کرے گا وہی اس کتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

دونوں نے شعر کا مطلب اپنے اپنے طور پر بتلایا بیگم راس مسعود کی تشریح زیادہ بہتر تھی چنانچہ علامہ اقبال نے "بال جبریل" کے سرورق سے سر راس مسعود کے نام کی جگہ بیگم راس مسعود لکھدیا۔ اور کتاب انھیں دیدی۔

علامہ اقبال اور بیگم مسعود کے درمیان ایک دن اس موضوع پر بحث ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو عقد سے پہلے دونوں کے درمیان محبت اور اُنس کی جھلک کسی حد تک ضرور ہونی چاہیئے۔

---

[1] روزگار فقیر۔ ص ۱۵۴ [2] [3] روزگار فقیر ص ۱۵۵

جس پر علامہ نے فرمایا: "شادی[1] کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیئے۔"

ایک دن بیگم مسعود نے شکایت کے لہجہ میں کہا کہ مرد حضرات تو رقص و سرود کی محفلوں اور کلب کے ذریعہ اپنی تفریح کا سامان بہم پہنچاتے ہیں، لیکن عورتوں کو گھروں میں قید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: "میں[2] جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام تر خواتین ہی کا فائدہ ہے"

حکومتِ افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی افغانستان تشریف لے گئے تھے تاکہ ان سے تعلیمی و مذہبی امور میں مشورے لئے جا سکیں۔ اس موقع پر بیگم مسعود بھی ساتھ جانا چاہتی تھیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لئے سر راس مسعود کے لئے ممکن نہ تھا کہ انکار کر سکیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کو اس سلسلہ میں لکھا تاکہ ان سے رائے معلوم کی جا سکے۔ علامہ اقبال کا احترام دونوں کرتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا "کہ[3] حکومت افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و ترتیب کے لئے ہندوستان کے علماء کا وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یعنی بیگم صاحبہ کو رفیق سفر بنانے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم ماہرین تعلیم کے خیالات و نظریات پر ان کا وہ اعتماد ہی باقی نہ رہے گا، جس اعتماد کی بنا پر اس وفد کو بلایا گیا ہے۔"

علامہ کے اس مشورے کو دونوں نے پسند کیا۔

افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر اقبال سے دریافت کیا گیا کہ: "جب[4] قرآن کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔" جس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ بے شک قرآن کریم میں حصول علم پر بڑا زور دیا گیا ہے، لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب

---

[1] روزگارِ فقیر، ص ۱۵۶ [2] روزگارِ فقیر ص ۱۶۵ [3] روزگارِ فقیر، ص ۱۶۷۔ [4] روزگارِ فقیر، ص ۱۶۵

میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں"

اور علامہ نے اس کا عملی ثبوت یہ دیا کہ اپنی بچی منیرہ کے لئے علیگڈھ سے ایک معلمہ کا انتظام کیا تاکہ گھر ہی پر بچی کو اچھی تعلیم دی جا سکے۔

شعر کہتے وقت علامہ اقبال پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہی کیفیات بغیر کسی وقت کے شعر کے قالب میں ڈھل جاتے تھے۔ دوران قیام بھوپال میں بیگم راس مسعود کو علامہ اقبال کی اس کیفیت کا تجربہ ہوا۔ چنانچہ وہ بتاتی ہیں — "ڈاکٹر[1] صاحب کی شعر گوئی کی کیفیت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے وجدان پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ جب ایسا وقت آتا تو ڈاکٹر صاحب خلوت و تنہائی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس فرماتے۔ وہ ایسے میں کسی کو اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرتے، یہاں تک کہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بلا تکلف کہہ دیتے کہ بھائی اس وقت تو میں تنہائی چاہتا ہوں۔ ہاں کل کسی وقت آنا پھر فرصت سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب کے تکیہ کے نیچے سے جو کاغذ برآمد ہوتا وہ تازہ ترین شعروں سے مزین ہوتا"

علامہ اقبال اپنی قوم کے لئے بیحد فکر مند رہا کرتے تھے۔ اکثر اس فکر سے اس قدر بےچین ہو جاتے تھے کہ دیر تک کوٹھی کے شہ نشین پر تنہا جاگتے رہتے اور زار و قطار روتے تھے۔ وہ کہتے تھے:

"قوم[2] کا تاریک مستقبل خود اپنی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جاتا ہے اور افراد کی بےحسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی جاتی ہے"

علامہ اقبال کو سر راس مسعود اور بیگم مسعود سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے بھوپال میں بڑے اصرار سے ایک خوش الحان قاری کو مقرر کرنے کو کہا تھا

---

[1] روزگار فقیر۔ ص ۱۵۸ [2] روزگار فقیر۔ ص ۱۵۳

تاکہ ہر روز صبح کو وہ بیگم مسعود کو کلام پاک سنائیں۔ علامہ کا خیال تھا کہ دوران حمل میں ماں اگر اچھے لہجے کے ساتھ قرآن سنا کرے تو اس کا اچھا اثر بچے پر پڑتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بیگم مسعود کو دوسری بچی پیدا ہونے والی تھی۔

جناب رشید احمد صدیقی تحریر کرتے ہیں — "مرحوم[1] کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی خیال رکھتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا: قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں۔ مرحوم خاموش ہو گئے۔ فرمایا: صبر، علی بخش صبر۔ یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔"

خدا کے فضل و کرم سے سر راس مسعود کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ علامہ کو یہ خبر سن کر بہت خوشی اور اطمینان ہوا کہ زچہ و بچہ دونوں بفضلہ خدا بخیر ہیں۔ علامہ اقبال ہی کی پسند سے اس بچی کا نام نادرہ رکھا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے مندرجۂ ذیل تاریخی قطعہ قلمبند کیا ؎

راس[2] مسعودِ جلیل القدر کو ۔۔۔ جو کہ اصل و نسل میں مجدود ہے
یادگار سیّدِ والا گہر ۔۔۔ نورِ چشم سید محمود ہے
راحتِ جان و جگر دختر ملی ۔۔۔ شکر خالق منت معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود ۔۔۔ باعثِ برکاتِ لامحدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی ۔۔۔ باسعادت دخترِ مسعود ہے

---

[1] گنج گرانمایہ۔ ص ۱۵۸
[2] روزگار فقیر۔ ص ۱۶۴

علامہ اقبال کو سر راس مسعود کے پہلے بچے کے انتقال پر بڑا افسوس ہوا تھا۔ چنانچہ لیڈی مسعود کی تسلّی و تسکین کے لئے جب خط لکھا تو آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

در چمن بود ولیکن نہ تواں گفت کہ بود

آہ! ازاں غنچہ کہ بادِ سحر اورا نہ کشود

نادرہ کی پیدائش اندور میں اپنے ناناں عبدالرشید خاں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں علامہ بھوپال ہی میں تھے۔ پیدائش کے تھوڑے دنوں ہی کے بعد بیگم مسعود بغیر اطلاع دیئے ہوئے بھوپال آگئیں۔ اُس وقت سر راس اور علامہ اقبال یکجا تھے۔ سر راس، بیگم کی اس اچانک آمد پر بے حد خوش ہوئے اور انتہائی شوق میں آگے بڑھ کر نادرہ کو گود میں لینا چاہا، علامہ نے جو خود بھی بے انتہا مسرور تھے فوراً کہا کہ "پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے"[1] چنانچہ بیگم مسعود نے بچّی کو علامہ کی گود میں دے دیا۔

جس زمانہ میں علامہ بھوپال میں تھے۔ بیگم مسعود کے والد اندور میں تھے۔ اُنھوں نے علامہ کی دل بستگی کے لئے اندور سے ایک مصاحب بھیجا تھا ان کا نام عبدالحکیم تھا۔ وہ اپنی طبیعت کی شوخی اور مزاج کی ظرافت کی وجہ سے "چرکی" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ لوگوں کے مزاج پہچان کر گفتگو کرتے تھے اور اسی مناسبت سے لطیفے کہا کرتے تھے۔ علامہ اقبال بھی چرکی سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ جب علامہ بھوپال سے رخصت ہونے لگے تو اس کی تعریف کی "چرکی" اس تعریف سے بے حد خوش ہوئے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ انھیں اس عظیم انسان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہ علامہ کے شیدائی ہوگئے تھے۔ چنانچہ جب علامہ کے انتقال کی خبر ملی تو بقول مصنف روزگار فقیر[2] "وہ پھوٹ پھوٹ کر

---

[1] گنجہائے گرانمایا۔ ص ۱۶۰ [2] روزگار فقیر۔ ص ۱۵۹

رونے لگا۔ جیسے اس کے کسی ہمدرد اور کرم فرما بزرگ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا ہے۔ اس غریب کے پاس جو کچھ جمع پونجی تھی اس کا کھانا پکوا کر ایصال ثواب کے لئے غریبوں میں تقسیم کیا۔ عبدالحکیم چمڑی کی عقیدت ومحبت کے اس مظاہرے کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے قریبی دوست تک حیران رہ گئے۔"

علامہ اقبال بھوپال میں بہت کم ادھر اُدھر نکلتے تھے۔ البتہ شام کے وقت ٹہلنے کے لئے جایا کرتے تھے اور جمعہ کے دن جامع مسجد نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ بہت کم لوگوں سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ ملنے والوں میں اُمراء سے زیادہ غرباء کو وہ پسند کرتے تھے۔ اُن سے ملنے میں علامہ پہل کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ غلام السیّدین تحریر کرتے ہیں ——— "انتقال[1] کے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے یہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے۔ اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو، برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے جنھوں نے کہا ہے: خیر و خوبی بر خواص آمد حرام

دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

پروفیسر محمد زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی حمیدیہ کالج (بھوپال) کا بیان ہے کہ علامہ نے جب شیش محل میں آکر قیام کیا تو وہ آٹھویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علامہ کو جو سرکاری موٹر ملی تھی اُس کے ڈرائیو جسیم حیدر تھے وہ جو زبیر صاحب کے ملاقاتی تھے۔ چنانچہ وہ اسکول سے واپسی پر اس موٹر پر بیٹھ جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک روز ڈاکٹر صاحب مکان سے باہر[1]

---

[1] آندھی میں چراغ - ص ۱۳۱

غالباً وہ شملہ کی طرف جارہے تھے، انھیں دیکھ کر جسیم حیدر سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں۔ جسیم حیدر نے بتایا کہ میں قاضی صاحب کا پوتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور دریافت کیا کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ عربی پڑھتا ہوں تو اُنھوں نے عربی کی گردان پوچھی اور مختلف قسم کے سوالات کئے۔ زبیر صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد اکثر اس طرح علامہ سے ملاقات ہوتی رہی۔

جناب حکیم قمرالحسن صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ ندیم بھوپال فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں علامہ اقبال کا قیام شیش محل میں تھا، وہ حکیم اولاد حسین صاحب کے ساتھ علامہ سے ملنے گئے حکیم اولاد حسین، قمرالحسن صاحب کے رشتے کے بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ وہ پانی کے علاج میں کافی تجربہ کار تھے۔ علامہ اقبال اُن سے طبی مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک تو علاج کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد حکیم اولاد حسین صاحب نے قمرالحسن صاحب کا تعارف کرایا۔ اس وقت قمرالحسن صاحب کی عمر مشکل سے ۲۲ سال کی ہوگی۔ علامہ نے ان سے مختلف سوالات کئے اور دریافت کیا کہ "کیا لکھتے ہو"۔ اس زمانے میں حکیم قمرالحسن صاحب افسانے اور انشائے لطیف لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئی پود ٹیگور کی انشاءنگاری سے متاثر تھی۔ چنانچہ جب انھیں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو افسانے اور انشائے لطیف کا شوق ہے تو فرمایا کہ انشائے لطیف بے مقصد چیز ہے۔ نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ کوئی صحت مند اور تعمیری ادب پیش کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ طلبہ کو چاہئے کہ پہلے علم حاصل کریں اس لئے کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

ممنون حسن خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ اقبال نے سر راس مسعود سے کہا کہ حیدرآباد میں اُردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ آپ کا تعلق مہاراجہ اندور سے ہے۔ آپ کوشش کیجئے کہ اندور میں ہندی یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ سر راس مسعود نے علامہ کی یہ بات بہت پسند کی اور کہا کہ بھوپال میں ہر جمعہ کو اندور اور اجین سے سنسکرت اور ہندی کے علماء آتے ہیں اور

آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یہاں ترجمہ کا کام بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ میگھ دوت کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اب کالیداس کے مشہور ڈرامہ شکنتلا کے ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔ علّامہ اقبال یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

علّامہ بھوپال میں تعلیم کے خواہاں تھے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ سر راس مسعود یہاں کے وزیر تعلیم ہیں اور اس لئے امید کرتے تھے کہ یہاں تعلیم عام ہو گی۔ وہ نواب صاحب سے بھی خوش تھے اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ نواب صاحب اچھے دل اور روشن دماغ حکمراں ہیں۔ اس لئے انھیں امید تھی کہ قوم اور ملک کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچے گا۔

بھوپال کے مایۂ ناز مصوّر جناب عبدالحلیم انصاری جن کی کوئلہ کی بنائی ہوئی تصویر ہم اس مقالے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال سے دورانِ قیام بھوپال دوبارہ ملے چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ سر محمد اقبال سے پہلی مرتبہ سر راس مسعود مرحوم کے یہاں 'ریاض منزل' میں ملاقات ہوئی اور دوسری مرتبہ جب وہ شیش محل میں مقیم تھے۔ چوں کہ سر راس مسعود نے خاص طور سے انھیں علامہ اقبال کے کمرے میں لے جاکر تعارف کرایا تھا اس لئے علامہ نے بھی خاص التفات فرمایا۔ چنانچہ عبدالحلیم انصاری صاحب جب علامہ سے ملنے کے لئے شیش محل گئے تو اُنھوں نے اُنھیں شلوار پہنے پلنگ پر بیٹھا پایا۔ حقّہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر فرمایا: "سر راس مسعود نے آپ کے بارے میں کئی پسندیدہ باتیں تبلائی ہیں۔ میں چونکہ اُن کے مزاج سے واقف ہوں اس لئے آپ کو اچھی طرح سمجھا اور خوش ہوا۔"

عبدالحلیم انصاری صاحب نے کہا "آپ سے شرف نیاز میرے لئے اعزاز ہے اور خوش نصیبی بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت فرمائے۔ مجھ کو آرٹ کے متعلق بہت سے مسائل سمجھنا اور بہت سے مراحل حل کرنا ہیں منزل عرفان کے"۔ اتنی باتیں اُنھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ کہی تھیں

علّامہ اقبال نے دریافت کیا: آپ کا سبجیکٹ کیا ہے

عبدالحلیم صاحب نے جواب دیا "فطرت کشی اور مطالعہ فطرت" اور یہ بھی کہا کہ" میں عام آرٹسٹوں کی طرح فطرت کو پینٹ ہی نہیں کرتا بلکہ اُسے پڑھتا ہوں - فطرت میرے نزدیک ایک کتاب ہے الہامی جس کے مطالعہ سے روشنیاں حاصل ہوتی ہیں - الہام و عرفان کی، اور رموز و نکات و اشگاف ہوتے ہیں علوم و فنون کے"

حلیم صاحب فرماتے ہیں کہ " میرے خیالات سے علّامہ نے دلچسپی لی اور فرمایا: "آپ نے دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے " میں چونکہ آجکل معالجین کی ہدایت کا پابند ہوں - اس لئے پھر باتیں کروں گا " اس زمانے میں علّامہ بجلی کے علاج کا ایک خاص کورس پورا کر رہے تھے اس لئے عبدالحلیم صاحب نے بھی احتیاط برتی - اگرچہ انھیں اس کا بہت افسوس ہوا - وہ کہتے ہیں کہ " اگر اس وقت کچھ مواقع حاصل ہو جاتے تو اس " دیدہ ور" کی بدولت حقائق معارف کے بہت سے سربستہ راز وا ہو جاتے - الوان فطرت کی تفہیم و تشریح، آیات فطرت کی نگارش و اشاعت ایک نئے اسلوب و انداز سے عمل میں آتی ہے، جس کے سبب انسان آرٹ اور فطرت کے قدیم اور روحانی رشتہ کو سمجھ سکتا اور ان کے الہامی پیغام کو جان سکتا"

میں نے جب دریافت کیا کہ علامہ سے ملاقات کا اسقدر اشتیاق کیوں تھا تو فرمایا" اس لئے کہ مجھے ایسے عارف کامل کی تلاش تھی جس کے پاس تسخیر کائنات کا عمل بھی ہو اور وہ واقف اسرار ازل بھی ہو - اس مقصد کے پیش نظر اور حصول زندگی کی خاطر ذوق و وجدان کو ساتھ لئے جستجو کی منزل پر تھا، علامہ اقبال سے ملنے کے لیے اس لئے بھی میرا جذبۂ شوق مچل رہا تھا کہ وہ فن کا نقاد اور قدرداں تھا - قدرداں وہی ہو سکتا ہے جو نقاد بھی ہو سچا - سچا نقاد وہی ہو سکتا ہے جو ماہر ہو فن کا - عدل و انصاف اس کی صداقتِ رائے کا مظہر ہو - چوں کہ وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھا اس لئے اس نے فن کی تخلیق و نمود کو معجزۂ فن سے تعبیر کیا ہے

معجزۂ فن سے ہے خونِ جگر کی نمود

جہاں وہ ایک اچھا نقاد و فنکار تھا۔ اچھا سازندہ فطرت بھی تھا۔ اس لئے میں نے بربطِ قلب پر اسے کچھ راگ سنائے تھے اس یقین اور اعتماد پر ؎

جس روز دل کے رمزِ مغنّی سمجھ گیا سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

علّامہ سے ملاقات کی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ فطرت اور آرٹسٹ کے فطری تعلّق اور روحانی رشتے کو سمجھتا تھا۔ دونوں کے مزاج اور مذاق سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ فطرت اپنی جگہ پر حسین ہے بے شک، لیکن اس کو حسین سے حسین تر بنانے والا آرٹسٹ ہے۔ اسی لئے اس نے کہا بھی ؎

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود

اقبال رمزہائے فطرت کا امین و معتمد بھی تھا اور ترجمانِ فطرت بھی جس نے بہ پاس اعتماد و دیانت بہت سی چیزیں مصلحتاً رمز و کنایہ میں ادا کی ہیں اور اپنی اس مصلحت کو ظاہر بھی کیا ہے یہ کہہ کر ؏ حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایماں نیست

اور جب میں نے دریافت کیا کہ آپ نے علّامہ کی تصویر کس جذبہ کی وجہ سے بنائی تو انھوں نے جواب دیا کہ علامہ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران جتنا اشتیاق ملاقات تیز ہوتا گیا جذبۂ عقیدت بھی بڑھتا گیا۔ اسی نے میرے دل میں علامہ کی تصویر بنانے کی بنا ڈالی۔ جس کی وجہ سے میں اپنی عقیدت کیشی کو قلمکاری کے ذریعہ ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا جو شبیہ اس وقت مقالے کی زینت ہے وہ قلم مصوّر کا نقش عقیدت ہے۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کا بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کی خبر جب علامہ کو ملی تو وہ بےچین ہو گئے اور پہلے تار پھر ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء کو خط ممنون حسن خاں صاحب کو لکھا:

"سید مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صبح اٹھتے ہی اخبار زمیندار سے معلوم ہوئی

میں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر آپ کے نام تار لکھا کہ اتنے میں سول ملٹری گزٹ
سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ سخت پریشان ہوں
مفصّل حالات سے مجھے آگاہ کیجئے۔ میرے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے

(اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۳۲۶)

"ذکر اقبال" میں عبد المجید سالک صاحب تحریر کرتے ہیں۔ "دوست قدیم نواب ذوالفقار علی خاں اور ہمدم و دمساز رفیقۂ حیات (والدۂ جاوید) کی موت نے علامہ کو اس عالم ضعف و علالت میں بے حد روحانی صدمہ پہنچایا لیکن ابھی ایک اور جانکاہ حادثہ باقی تھا۔ سید راس مسعود جن سے علامہ کے قلبی اور روحانی تعلّقات تھے اور جنھوں نے علامہ کی خاطر داری اور خدمت و تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اواخر جولائی ۳۷ء میں دفعتاً انتقال کر گئے۔ علامہ نے یکم اگست ۳۷ء کو لیڈی مسعود کے نام تعزیت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے وفور اضطراب نمایاں ہے" (ذکر اقبال ص ۲۱۵)

۷ اگست ۱۹۳۷ء کو ممنون صاحب کو خط لکھتے ہیں جس میں سر راس مسعود کے کتبہ مزار کے لئے وہ رباعی بھیجی جو اپنے کتبہ مزار کے لئے تحریر کی تھی۔

ڈیر ممنون صاحب مسعود مرحوم کے کتبہ مزار کے لئے میں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدیم دمے چند گلاں رنگ آب دادہ رفتم

یہ رباعی میں نے اپنے مزار کے لئے لکھی تھی لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو اُن سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ رُباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع اُن کے سنگِ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں

بہتر ہو گا۔ اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں

خواب را مرگ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

باقی خیریت ہے۔ مسعود کا غم باقی رہیگا جبتک میں باقی ہوں۔" (اقبال نامہ صفحہ ۳۲۹)

۲ر اکتوبر کو علامہ ممنون حسن خاں سے اسلامی فیملی لا کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو مسعود مرحوم کا ذکر اسی غمناک لہجے کے ساتھ کرتے ہیں۔ " شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ ریاست بھوپال میں اسلامی فیملی لاء کے متعلق علماء کے مشورے کے بعد ایک Enactment وضع کیا گیا تھا۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو شعیب صاحب سے معلوم کیجئے اور اس کی ایک کاپی لے کر مجھے بھیجدیجئے زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ مسعود نہیں بھولتا۔" (اقبال نامہ حصّہ اول صفحہ ۳۲۴)

علامہ نے سر راس کی موت پر جو نظم لکھی تھی وہ ارمغان حجاز میں "مسعود مرحوم" کی سرخی سے شائع ہوئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی — وہ کارواں کی متاع گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی — فغان مرغ سحر کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

علامہ اقبال کو سر راس کی وفات پر جو صدمہ ہوا تھا اس کا اندازہ لیڈی مسعود کے تعزیتی خط سے ہوتا ہے "میں آپ کو صبر کی تلقین کیوں کر کروں جبکہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔"

مندرجہ بالا جملے اس شخص کے ہیں جو زندگی کو جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں متصور کرتا تھا۔ اور جس نے ہمیشہ صبر و ضبط، ہمت و استقلال کا درس دیا۔

جب ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد نے "یوم اقبال" منانے میں پہل کی اور اس کی

صدارت کے فرائض نظام دکن کے ولیعہد شہزادہ برار نے انجام دیئے تو اس موقع پر نواب حمید اللہ خاں نے حسب ذیل پیام بھیجا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال کی عظمت کے کس حد تک قدرداں تھے:

"مجھے مسرت ہوئی کہ "یوم اقبال" ہز ہائینس پرنس آف برار ولی عہد خانوادۂ آصفی کی صدارت میں منایا جارہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قومیت کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کر ان میں احساس بیداری پیدا کردیا۔" (اقبال اور حیدرآباد صفحہ ۲۵)

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح ساری دنیا اور خصوصاً عالم اسلامی کے لئے غمناک سانحہ کا پیام لے کر آئی۔ ادھر نیر اعظم طلوع ہورہا تھا اُدھر آفتاب علم و حکمت جس نے سالہا سال تک اپنے افکار و خیالات کی روشنی سے دنیا والوں کے قلب کو منور کیا تھا، غروب ہورہا تھا۔ ساڑھے چھ بجے صبح وہ منحوس گھڑی تھی جس نے شاعر مشرق سے دنیا کو محروم کردیا۔ علامہ اقبال اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔

اس جانکاہ خبر نے ساری دنیا کو مغموم کردیا۔ خصوصیت سے ہندوستان کا چپہ چپہ ماتم خانہ بن گیا۔ جو قریب تھے وہ جاوید منزل کی طرف دوڑے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اور اپنے محبوب شاعر کا آخری دیدار کرتے ہوئے اسے سپرد خاک کیا۔ جو دور تھے انھوں نے تعزیتی جلسے اور رزولیشن کے ذریعہ اظہار غم کیا۔ بھوپال سے تو علامہ کا آخری زمانے میں بڑا گہرا تعلق ہوگیا تھا۔ اگرچہ وہ اس زمانے میں بھوپال تشریف لائے تھے جبکہ بیمار تھے اور اسی وجہ سے نہ تو وہ اس شہر کے علمی اور ادبی جلسوں میں شریک ہوئے نہ ہی ان کا یہاں کے عام لوگوں سے تعلق پیدا ہوسکا بلکہ خاص لوگوں ہی تک ان کے تعلقات محدود رہے اور شہر کے کچھ ہی لوگ اُن سے ملاقات کرسکے۔ ممنون حسن خاں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن۔ ڈاکٹر عبدالباسط، ڈاکٹر سلطان صاحبان کے علاوہ مائل نقوی، پنڈت ایا، سیٹھ وٹھل داس، راجہ اودھ نرائن بسریا،

رائے زادہ گوبند پرشاد آفتاب، ذکی وارثی، ارشد تھانوی، حامد سعید خاں، عبدالرزاق مصنف البرامکہ، حکیم ضیاءالحسن، ملا رموزی، قاضی محمد حسن صاحب قاضی شہر، مفتی انوارالحق، عبدالحلیم انصاری، یوسف قیصر، جسٹس سلام الدین، حکیم قمرالحسن، آصف شاہمیری وغیرہ صاحبان قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن شہر کے عام لوگ بھی ان سے محبت کرتے تھے اور بھوپال میں ان کی آمد پر نہ صرف خوش تھے بلکہ فخر کرتے تھے۔ چنانچہ موت کی خبر نے سارے شہر میں غم کی لہر دوڑا دی۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے جن میں اس عظیم نقصان پر اظہار افسوس کیا گیا اور اپنے محبوب شاعر کی مغفرت کے لئے دعائیں کی گئیں۔

۲۳ راپریل کو اہل بھوپال کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب سلام الدین خاں (سابق چیف جسٹس بھوپال) میونسپل بھوپال کے میدان میں منعقد ہوا۔ جس میں ایک ہزار کے قریب ہندو مسلمانوں نے شرکت کی۔ جلسہ کی روئداد حسب ذیل ہے:-

"جلسہ کا افتتاح قرآن حکیم کے پارۂ سیقول کے دوسرے رکوع سے کیا گیا، بعدازاں صاحب صدر کی اجازت سے جناب چودھری محمد اطہر صاحب بی اے۔ ایل ایل بی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بلدہ بھوپال نے رزولیشن پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ یقیناً درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ نے علامہ سر محمد اقبال تاجدار سخن کی زندگی پر تبصرہ مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کو انعقاد جلسہ کی غرض سے آگاہ فرمایا۔

اس کے بعد ماسٹر آفاق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر جہانگیریہ اسکول نے علامہ اقبال کی ذاتی خصوصیات اور شاعری سے بہت وضاحت کے ساتھ حاضرین کو متاثر فرمایا۔ تیسر انمبر بھوپال کے ایک سنسکرت عالم پنڈت لچھمن جی آیا کا تھا۔ آپ کی تقریر کا موضوع اقبال کی "مشرق سے محبت" تھا۔ آپ نے ان شعروں سے تقریر کا آغاز فرمایا:

دلا نا دانئی پروانہ تا کے   نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را ز سوزِ خویشتن سوخت   طوافِ آتش بیگانہ تا کے

آپ نے ان اشعار سے اقبال کے ان جذباتِ محبت کو واضح کیا ہے جو ان کے دل میں

اپنے ملک ہندوستان سے بچھڑے ہوئے تھے۔

ازاں بعد جناب مولوی عبدالرزاق صاحب مؤلف "البرامکہ" اور جناب سید رزمی صاحب نے ریزولیشن کی تائید میں جو تقریریں فرمائیں اُن میں اقبال کی شاعری اور ان کے نظریہ کی خصوصیات کی وضاحت میں خاص خاص چیزوں کو پُرسوز الفاظ میں دوسرے نامور شعراء سے مقابلہ کرتے ہوئے حالی مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ لیکن اقبال مرحوم کی اس خصوصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا کہ مرحوم نے فنی اور ذہنی حیثیت سے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ نظامِ قدرت نے جو فضا پیدا کر رکھی ہے اس سے وہ متاثر تھے۔ علم کا نصب العین ان کے ذہن میں حکومت کی کرسیاں حاصل کرنے سے بہت بلند تھا۔ مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعے فلسفہ، تعلیم اور اس کے اصول سے ملک کو آشنا بنا دیا۔"

دوسرا تعزیتی جلسہ بھوپال کے تمام خادمانِ علم و ادب کا زیرِ صدارت مولانا سید حامد رضوی صاحب، وکیل، دفتر اخبار ندیم میں ۲۴ر اپریل ۱۹۳۸ء بوقت ۶ بجے شام منعقد ہوا۔ ذیل کے حضرات نے جلسہ میں شرکت فرمائی :-

(۱) مولانا سید حامد رضوی صاحب وکیل سابق ممبر لجسلیٹو کونسل بھوپال۔ (۲) مولانا ارشد تھانوی صاحب وکیل۔ (۳) مولانا عبدالجلیل صاحب مائل نقوی۔ (۴) مولوی محمد احمد صاحب سبزواری بی۔اے (عثمانیہ)۔ (۵) مسٹر محمود الحسن صدیقی بی، اے علیگ مدیر ندیم۔ (۶) مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم ذخائر۔ (۷) ضیاء الملک ملا رموزی۔ (۸) ماسٹر سید ناصر علی صاحب ناصر اٹاوی۔ (۹) ماسٹر سلیمان محمد خاں صاحب آرزو۔ (۱۰) مسٹر سید حسن بی اے۔ علیگ۔ (۱۱) مسٹر منیر مظفر سیفی مدیر معاون ندیم۔ (۱۲) منشی سید لطف علی صاحب اسسٹنٹ ریونیو سکرٹیری ڈیوڑھی عیدگاہ کوٹھی۔ (۱۳) مولوی عبدالقیوم صاحب۔ (۱۴) منشی ظہور الحسن صاحب (۱۵) منشی محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف، (۱۶) منشی مطلوب عالم صاحب فاروقی۔ (۱۷) منشی رحیم حسین صاحب۔ (۱۸) مولانا احسان رسول صاحب۔ (۱۹) مسٹر نفیس احمد فاروقی

(۲۰) مسٹر مصباح الدین احمد۔ (۲۱) منشی نواب حسن صاحب (۲۲) منشی شبیّر حسن صاحب (۲۳) منشی قریش مسیح وغیرہ۔

جلسہ کا افتتاح تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مولانا احسان رسول صاحب نے سورۂ یٰسین کے تیسرے رکوع کی قرأت فرمائی۔ جس کو حاضرین جلسہ نے ادب سے کھڑے ہو کر سنا۔ اس کے بعد ذیل کے تین رزولیشن جلسہ میں پیش ہو کر باتفاق رائے منظور ہوئے:۔

(۱) بھوپال میں شیفتگان اور خادمان علم و ادب کا یہ غیر معمولی جلسہ مشرق کے "شاعر اعظم" ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم، اے۔ پی۔ ایچ ڈی بار ایٹ لا کے بے وقت اور پُر الم سانحۂ وفات پر اپنے انتہائی حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے اور اس کو ملّت اسلامیہ کے لئے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ عالمِ اسلامی کو آپ کی حکیمانہ رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔

(۲) یہ جلسہ ہندوستان کے بلند پایہ شاعر، مفکر اور رہنما کے ان تمام علمی، ادبی اور ملّی خدمات کا دلی جذباتِ محبت و عقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اور ان کو ملّت اسلامیہ کے لئے خصوصاً اور تمام مشرقی اقوام کے لئے باعثِ احیاء و بیداری قرار دیتا ہے۔"

(۳) یہ جلسہ علاّمہ خلد آشیاں کے تمام اعزّاء اور پسماندگان کے ساتھ اس ماتم خیز سانحہ پر دلی رنج و الم کے ساتھ پرخلوص ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔"

صاحب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں انتخاب صدارت پر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ "مجھ پر ایسے جلسۂ تعزیت کی صدارت کا بار رکھا گیا ہے جس سے ہمارا دل درد و غم سے نڈھال ہے۔ اس لئے کہ ہم سے آج وہ چیز چھین لی گئی ہے جس کی ابھی ہماری قومی و ملّی بلکہ مُلکی اور سیاسی زندگی کے لئے سخت ضرورت باقی تھی اور جس کا بدل اس وقت مستقبل قریب میں ہم کو نظر نہیں آتا۔ علاّمہ اقبال ہندوستانی قومیت کے لئے کیا رائے رکھتے تھے میں نہیں بتلا سکتا اور یہ کہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے کن کن علوم کے وہ ماہر تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ سارا ہندوستان اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا اور یورپ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

ان کی شاعری جو اپنے رنگ کی نرالی تھی نہ صرف مسلمانوں کے دل سے مملو تھی بلکہ سارے ہندوستان اور ایشیا کا اس میں درد بھرا ہوا تھا۔ آخر میں آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ اس عظیم الشان نقصان سے ہم اپنے دل میں درد محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کی خدمات ملکی و ملی مالک حقیقی قبول فرما کر اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے "۔

اس کے بعد جناب محمود الحسن صدیقی ایڈیٹر ندیم نے علامہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت پر روشنی ڈالی جو صحیح طور پر قابلِ تحسین و تشکر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "مشرقی اقوام کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً زندگی کا نظریہ ہے کہ "حالات و واقعات نے انسان پیدا کئے یا انسان حالات و واقعات پیدا کرتا ہے "۔ اقبال کے مشن نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان حالات کو بدلتا ہے، اس بلند پایہ مفکر، بلند مرتبہ شاعر و ادیب نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس کے اندر زندگی اور جوش ملی پیدا کیا۔ اس سلسلہ میں حالی کا نام بھی لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، لیکن اقبال کی شاعری میں بلندی عظمت اور انقلاب پیدا کرنے والی قوت مضمر ہے، گو ہم اقبال کی خدمت کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن ہم اس کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں "۔

جناب سبزواری صاحب نے فرمایا کہ " اقبال کی وفات سے ملک و قوم اور ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے، آپ نے اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ " اقبال نے اردو ادب میں ایک جدید دور کا آغاز کیا، اس لئے اس کو "امام ادب" کہنا بجا طور پر مناسب ہے۔ اقبال سے قبل اردو شاعری کی بنیاد گل و بلبل، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد تک محدود تھی۔

جناب ارشد صاحب تھانوی نے کہا کہ " اقبال نے اس دور میں جنم لیا جبکہ شعر و شاعری میں داغ کے رنگ کو پسند کیا جاتا تھا، اور ہر شاعر داغ کا تتبع کرتا تھا۔ اس وقت چند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اس پرانے رنگ کو چھوڑ کر ایک نئی روشنی اختیار کی اس میں علامہ اقبال۔ مولانا حالی اور پروفیسر آزاد کا خاص حصہ ہے۔ اقبال کی وفات ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی "۔

جناب مرزا مظفر سیفی نے کہا کہ اقبال آج ہمارے کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ وہ بحیثیت شاعر نہ صرف اُردو شاعری کے لئے باعث افتخار تھا بلکہ اس کی شخصیت ہندوستان کے لئے، ایشیا کے لئے اور عالم اسلام کے لئے مایۂ ناز تھی۔ اقبال نے جس نظریہ کے تحت مسلم اقوام کے احیاء کا مسئلہ پیش کیا وہ دوسرے الفاظ میں خود اقبال پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے، یعنی "قوم میں سے بعض جلیل القدر افراد آگے چل کر اپنی قوموں کو بنایا کرتے ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال ایک ایسی قوم اور ایسے ملک میں پیدا ہوا جس نے اس کی شخصیت کو اس وقت تک نہیں پہچانا جب تک اس کی شہرت کا آفتاب مشرق سے طلوع ہو کر اُفق مغرب کے نصف النہار پر نہ پہنچ گیا ہماری آنکھیں اُسوقت کھلیں جب مغربی اقوام "سر" کے خطاب سے اس کی عظمت کا اعتراف کر چکی تھیں۔ دنیا کی تمام قوموں نے اقبال کی بین الاقوامی شخصیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ بلکہ اقبال کو اپنانا بھی چاہا۔ جرمنی نے کہا "اقبال کی شاعری اور فلسفہ گوئٹے کا مرہونِ منت ہے"۔ اطالیہ نے کہا "اقبال نے ہم سے سب کچھ سیکھا ہے"۔ فرانس نے کہا "اقبال ہمارا ہے" حالانکہ اقبال وہی کہہ رہا تھا جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کہا جا چکا ہے۔ غرض وہ بین الملی اتحاد کا سب سے بڑا علمبردار تھا"

پہلی مئی (۱۹۳۸ء) کے اخبار ندیم میں ایک طویل اداریہ لکھا گیا۔ جس میں علامہ کے انتقال پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی۔ اداریہ میں کہا گیا:

"اقبال مرحوم ان انقلاب انگیز شعراء میں سے ہیں جن کی تخلیق ہنگامی تخلیق نہیں ہوتی وہ فطرت کے پیغامبر ہوتے ہیں، وہ پیدا ہوتے ہیں ایک عظیم الشان مشن لئے ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ اس مشن کو پھیلاتے ہیں۔ اس سبق کو خفتہ بخت قوم کو یاد دلاتے ہیں، جو وہ بھول چکی ہوتی ہے۔ اس کے اجزائے قومیت میں ہم آہنگی پیدا کر کے اس کے پریشان اور منتشر شیرازہ کو یکجا کرتے ہیں، اس کی اساسِ ملت کو استوار اور مستحکم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ملہمِ غیبی کی آواز ہوتی ہے، ان کا ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، ان کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے، سوز و گداز

ہوتا ہے اور وہ برق آشنا تڑپ ہوتی ہے، جس سے ایک مضمحل اور پس ماندہ قوم کے قویٰ میں حیات کے شرارے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً قوم کے مستقبل کے بانی ہوتے ہیں، وہی ملت کے حقیقی محسن، حقیقی راہبر اور صحیح معنوں میں مجدد اعظم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کو زندہ جاوید کہا جاتا ہے۔ قوم کی ہر نسل جن کے کلام سے روح حاصل کرتی ہے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کا مشن موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود لافانی ہوتا ہے، اقبال بھی ہندوستان، بلکہ عالم مشرق کے زندۂ جاوید شعراء میں سے ہے، جس کی روح پر مسلمانوں کی قوم ہمیشہ درود و رحمت بھیجے گی اور اُن کی ہر نسل اس کو اپنا سچا راہبر تصور کرے گی اقبال کا کلام ہر منزلِ حیات میں ان کی رہبری کرے گا، ہر مصیبت کے لئے اُن کو سینہ سپر بنا دے گا، ہر موقع پر ان کے لئے مشعل راہ ہوگا۔"

"اقبال جا چکے، اپنا شاندار مشن پورا کر گئے، ان کے انتقال پر ملک و قوم جتنا ماتم کرے کم ہے لیکن ماتم سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اہلِ ملک ان کی تعلیم اور ان کے بلند و برتر خیالات اعلیٰ و ارفع جذبات سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اُٹھاتے رہیں۔

اقبال اتحاد اور محبت و اخوت انسانی کے پیغام رساں تھے۔ اقبال کی صحیح پرستاری یہ ہے کہ ہم بھی دلوں میں اتحاد اور محبت و اخوت کی روشنی محسوس کریں اور ملک کی فضاء کو جو منافرت اور عناد و اختلاف سے مکدّر ہو رہی ہے اس کو اتفاق اور عام محبت و ہمدردی کی فضا سے بدل دیں۔"

بھوپال کے شعراء حضرات بھی علامہ کی وفات سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ ماتم اقبال میں کئی شعراء نے مرثیے لکھے جن میں علامہ محوی صدیقی، جناب حامد سعید خاں، جناب مائل نقوی، جناب حبیب الحسن صاحب قادری اور جناب اختر سعید خاں صاحب کے مرثیے نظر سے گزرے یہ تمام مرثیے الم کے درد و غم کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ـــــ جناب مائل نقوی کا مرثیہ "وصال اقبال" ملاحظہ کیجیے۔

جو یہ کہتا ہے ہوا اقبال کا اف انتقال
اِس کا یہ کہنا غلط یہ حادثہ بالکل محال

سننے والوں کو تو سننے کا بہانہ ہو گیا
دیکھنے والوں کو لیکن کیا کہوں کیا ہو گیا

ابنِ آدمؑ عالم ظاہر کا قائل کس قدر
عالم باطن کی کیفیت سے بالکل بے خبر

یہ بصارت اس طرح صرف عمل ہوتی رہے
اور قیامت ہے بصیرت بے خبر ہوتی رہے

یہ خبر اس کو نہیں فطرت کا ہر مقصد ہو فوت
"مرد مومن" پر ذرا غالب اگر آجائے موت

زندگی و موت کو پیروں سے ٹھکرائے ہوئے
ہیں یہی رہتے ہیں جو کونین پر چھائے ہوئے

وہ حیات ان کو عطا کرتا ہے خلاق الصمد
جس کا اک گوشہ ازل اور دوسرا گوشہ ابد

جز دکل کو نظروں سے رہتے ہیں گراتے ہوئے
موت تھرّاتی ہے ان کے سامنے آتے ہوئے

آ بتا دوں تجھ کو اے جیالے رازِ سرمدی
موت کی غفلت ہے کیا! اک شانِ حسنِ خودی

ہیں جو محو سیر کیفیات الا اللہ میں
موت بھی اک منزلِ اسفل ہے اسکی راہ میں

ان جوانمردوں کا یہ عالم نہیں غم کے لئے
یہ بھی اک "درس خودی" ہے اہلِ عالم کے لئے

"ہاں گزر جا موت کی منزل سے اٹھلاتا ہوا"
"مسکراتا رقص کرتا جھومتا گاتا ہوا"

اس جری کی موت پر اس طرح اظہارِ قلق
جرأت ہمت کا دیتا تھا جو عالم کو سبق

یہ بجا ہے دل میں جب ہوتا ہے دردِ جاں گسل
مضطرب ہو جاتے ہیں احساس، اوسان مضمحل

لاکھ ضبط نالہ و فریاد کا مقدور رہے
آدمی احساسِ غم پر فطرتاً مجبور ہے

بجلیاں گرتی ہیں جب پیہم حواس و ہوش پر
آہ آخر آہی جاتی ہے لبِ خاموش پر

ہاں جو رونا ہے تجھے تو اپنی ناکامی پہ رو
اپنی بربادی پہ اور اسکی سبک گامی پہ رو

تجھ کو رونا ہے کہ تیرا رہنما تھا مر گیا
فخر اُس کو ہے کہ اپنا کام پورا کر گیا

زندۂ جاوید تھا وہ زندگی میں جا ملا
غور کر تو زندگی سے اسکی تجھ کو کیا ملا

پوچھنا ہے مجھ کو اُن سے جو ہیں وقفِ شور و شین
نالہ و فریاد تھی کیا قسمتِ مرگِ حسین؟

سن پسِ پردہ ذرا اک کوئی صدائے راز ہے — ہاں اسی اقبال کی ہلکی سی اک آواز ہے
کہہ رہا ہے اے رہینِ رنجِ اقبال اسلام — منزلِ آفاق میں پہونچا دے یہ میرا پیام
ہے میری دردِ جدائی پر یہ صدمہ برمحل — تھا مری مرضی پہ فطرت کا مگر ہر اک عمل
ہو چکا بس میرے ماتم میں بہت انسو بہگئیں — زندگی ہے مختصر اب وقت رونے کا نہیں
حشر برپا کر رکھا ہے شورِ خاص و عام نے — امتحاں گاہِ عمل ہے دیکھ تیرے سامنے
گرمیِ ہمت سے اُٹھ شعلے کو شرماتا ہوا — برق بن کر بڑھ اکڑتا اور بل کھاتا ہوا
جستجوئے فطرتِ قومی میں کھو میری طرح — زندہ ہو کر زندۂ جاوید ہو میری طرح

(ندیم یکم مئی ۱۹۳۸ء)

جناب سید عبد الواحد صاحب مصنف Iqbal نے نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی خوبصورت بات کہی ہے :-

During the last phase, his stay in Bhopal, mainly for treatment, deserves special mention, as it served to strengthen the ties of mutual esteem and friendship which characterised his relation with the Nawab of Bhopal, whose munificient treatment reminds us of the relations bitween the duke of Weimar and Goethe.

(Iqbal – Seyd Abdul Wahid, P. 22)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے، علامہ کی صحت یابی کے لئے نواب صاحب نے مخلصانہ کوشش کی جسے اہلِ نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اقبال کے سیرت نگاروں نے دل کھول کر نواب صاحب کو سراہا۔ اقبال کے چاہنے والوں کے دلوں میں ان کا احترام اس قدر بڑھ گیا کہ عبدالواحد مصنّف "اقبال" نے کہا کہ نواب صاحب کا اقبال کے ساتھ وہی تعلق تھا جو "ڈیوک آف دیمر" کا گیٹے کے ساتھ تھا۔ بہرحال نواب صاحب کا یہ مخلصانہ اور ہمدردانہ سلوک نہ صرف ان کے لئے بلکہ اس سرزمین کے لئے باعثِ فخر بنا۔

بھوپال کے عوام نے بھی علامہ سے گہرے تعلق اور عقیدت کا ثبوت "اقبال لائبریری" اور سالہا سال تک "یوم اقبال" منا کر دیا۔ علامہ کی یادگار "اقبال لائبریری" کی بنیاد یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پڑی اور خدا کے فضل سے یہ کتب خانہ آہستہ آہستہ آج تک ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس کتبخانہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے جنرل سکریٹری نے اس کے دستورالعمل میں تحریر کیا ہے کہ "مفکرِ اعظم شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے اپنی شاعری سے جس طرح مردہ ہندوستانیوں کے دلوں میں زندگی کو رواں دواں کیا وہ عدیم النظیر اور بے مثال ہے۔

جس وقت علامہ کی یادیں ہر جگہ یادگاریں قائم کی جا رہی تھیں تو سرزمین بھوپال کی علمی و ادبی خدمات و روایات اور علامہ اقبال کا بھوپال سے قربِ تعلق کی بنا پر یونانی شفاخانے کے گرد و پیش کے چند سرپھرے نوجوانوں نے عزم مصمّم کیا کہ بھوپال میں علم و ادب کی ایسی شمع روشن کریں گے جو نہ صرف اقبال کی یاد تک محدود ہو بلکہ وہ عوام کو توسیع مطالعہ کے اہم مقصد سے روشناس کراتے ہوئے مطالعہ کی سہولتیں بہم پہنچائے"

اقبال لائبریری کے قائم ہونے کے بعد ہی سے یہاں "یوم اقبال" منانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جس کا مقصد تھا کہ عوام کو علامہ کے افکار و خیالات سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہاں سالہا سال تک "یوم اقبال" کا سلسلہ جاری رہا، جن میں مہاتما گاندھی، محمد علی جناح

سرتیج بہادر سپرو، محمد الیاس برنی، راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، بابائے اُردو مولوی عبدالحق وغیرہ صاحبان نے پیغامات بھیجے جن کے ذریعہ "یوم اقبال" کو سراہا گیا اور علامہ کی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔

وہ لوگ جنھوں نے "یوم اقبال" کے سلسلہ میں تقریریں کیں یا مقالات پڑھے حسب ذیل ہیں :- علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر احتشام حسین، کوثر چاندپوری، کامتاپرشاد لالہ ملک راج، سورج کلا سرور، پروفیسر سلیم حامد رضوی، حامد حسین، سردار جعفری، ایم عرفان، ابراہیم مدعو، مولانا وجدی الحسینی، آفاق احمد، زہرہ جمال، ابراہیم یوسف، آصف شاہمیری وغیرہ۔

منتظمین "یوم اقبال" نے اس کی اہمیت اور مقصد حسب ذیل بتائے ہیں :-

"زندہ قومیں اپنے نامور اسلاف کی یاد تازہ کر کے موجودہ نسلوں کو مردہ پرستی کا نہیں زندگی کا درس دیتی ہیں"

"علامہ اقبال گو اس عالمِ آب و گل میں موجود نہیں مگر ان کی شاعری اور ان کا پیغام آج بھی زندہ اور پائندہ ہے اور یہ ان کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت ہی ہے کہ ہر سال ہند اور پاکستان میں جابجا اس عظیم انسان کو مختلف صورتوں سے خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے"

"اقبال کا پیغام کیا تھا؟ بچھڑی ہوئی انسانیت کے لئے "قم" کی جاں بخش آواز! پست ہمتی اور بے عملی کے لئے حوصلہ افزا للکار۔ تنگ نظری اور تعصب کو وسیع المشربی اور فراخ حوصلگی کا درس، خودفراموشی اور خود فریبی کو خودی

اور خود آگاہی کی تعلیم، انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کردینے کی تلقین۔ غرضکہ ہماری ہیئتِ اجتماعی کو فرد یا جمعیت کی حیثیت سے جتنے بھی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان سب کا حل اقبال کے کلام اور پیغام میں موجود ہے چنانچہ اسی پیغام سے ایک نئی زندگی اور اسی کلام سے ایک نئی تازگی حاصل کرنے کے لئے ہم "یوم اقبال" منا رہے ہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس "یوم اقبال" میں مردہ پرستی کے رسوم ادا نہیں کئے جائیں گے، بلکہ مُردوں کو زندہ رہنے کا چلن سکھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ دن اُس شخصیت کی یاد میں منایا جارہا ہے جس نے مُردہ قوموں کی رگوں میں زندگی کا گرم خون دوڑایا ہے۔"

(پوسٹر - یوم اقبال - ۱۲ر جون ۵۸ء)

علامہ اقبال کا بھوپال میں قیام اس اعتبار سے مختصر رہا کہ وہ علاج کی غرض سے تین مرتبہ بھوپال تشریف لائے اور کم مدت کے لئے یہاں رہے

پہلی مرتبہ	۳۱ر جنوری ۳۵ء	سے	۸ر مارچ ۳۵ء	تک
دوسری مرتبہ	۱۷ر جولائی ۳۵ء	سے	۹ر ستمبر ۳۵ء	تک
تیسری مرتبہ	۲ر مارچ ۳۶ء	سے	۹ر اپریل ۳۶ء	تک

یعنی علاج کے سلسلہ میں مختلف وقتوں میں ان کا یہاں قیام تقریباً سوا چار ماہ رہا ——

لیکن اس مختصر قیام پر بھی یہ سرزمین جس قدر فخر کرے جائز ہے۔ یہ اس سرزمین کی خوش نصیبی ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی خدمت کا اسے کچھ موقع ملا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

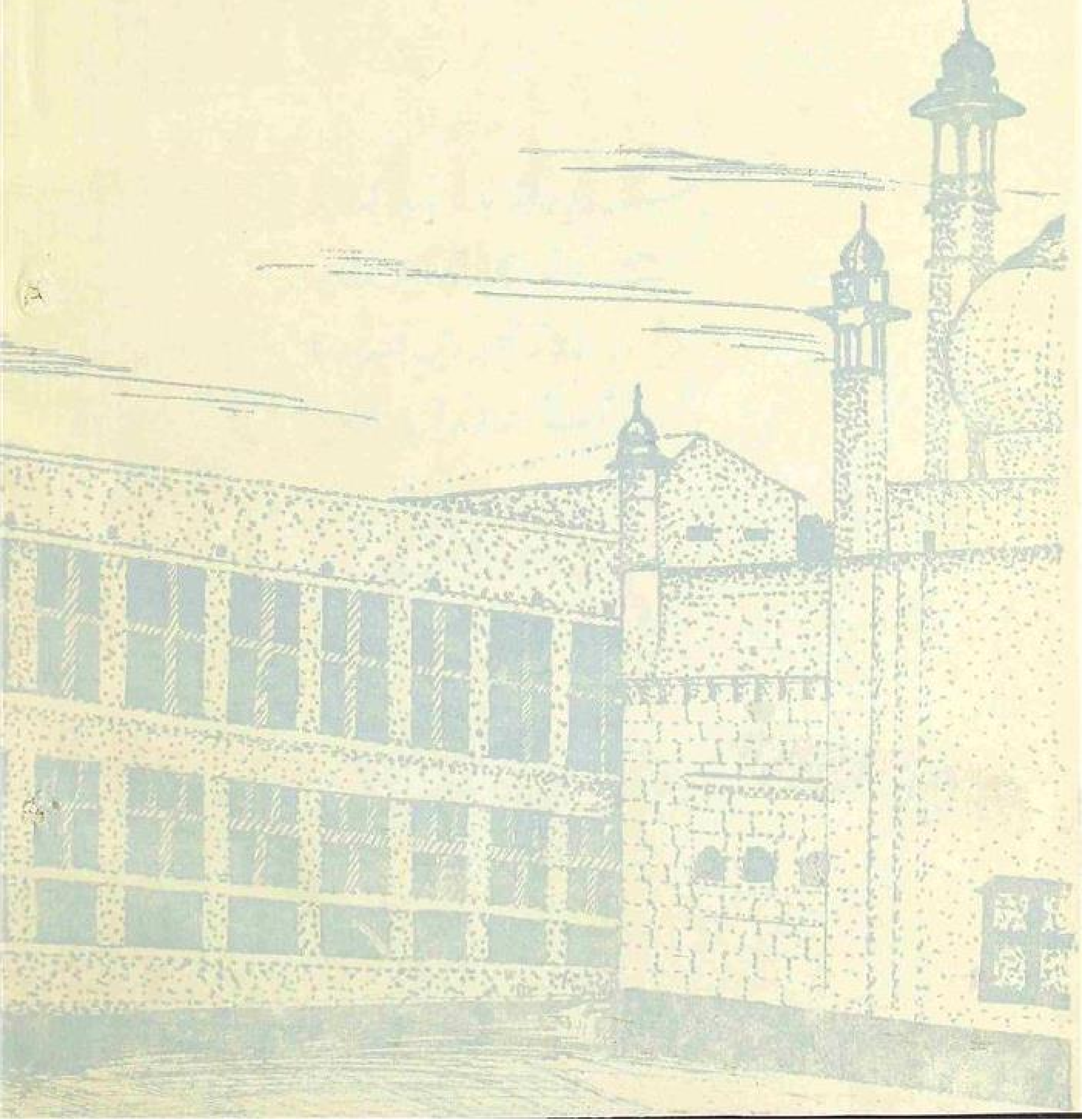

سیفیہ کالج بھوپال

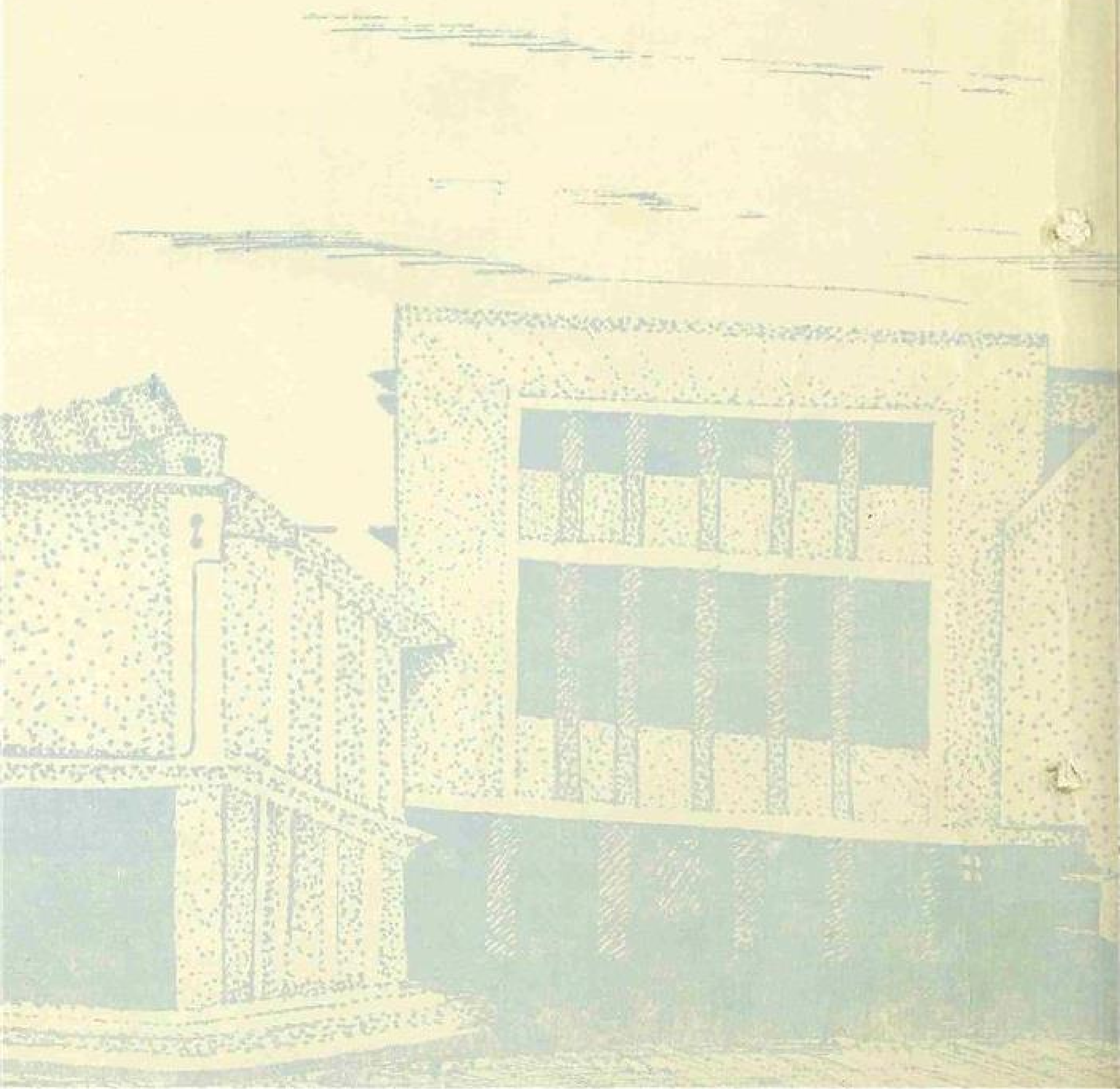

DEPARTMENT OF URDU

SAIHA COLLEGE, BHOPAL